ایک مطالعہ

برج پریمی
ایک مطالعہ

ڈاکٹر رتن لال شانت صاحب
کے لئے
خلوص کے ساتھ
برائے
اظہار خیال
پریمی رومانی
9/12/93 جموں

مرتبہ

پریمی رومانی

دیپ پبلی کیشنز

پریس موڑ، باغِ باہو، جموں (توی)

1993

رچنا ایمہ نے
فوٹو لیتھو ورکس، دہلی سے چھپوا کر
دیپ پبلی کیشنز، جموں (توی)
سے شایع کی۔

تعداد ــــــــ 600

Rs. 150/-
قیمت :- ایک سو پچاس روپے

ملنے کے پتے ــــــــ

سیمانت پرکاشن، 922 کوچہ روہیلا خان II فلور
دریا گنج، نئی دہلی

ونود بک ڈپو، پکہ ڈنگہ، جموں (توی)

ترتیب

		صفحہ نمبر
پیش گفتار	پروفیسر عنوان چشتی	7
● شخصیت اور فن:		
برج پریمی — ایک مطالعہ	محمد اسداللہ وانی	13
درد کا امانت دار — برج پریمی	کشمیری لال ذاکر	29
میرا رفیق میرا ہمدم	موتی لال ساقی	44
یار زندہ نہیں صحبت باقی ہے	پشکر ناتھ	52
برج پریمی — ایک انسان ایک ادیب	ڈاکٹر ظہور الدین	56
کہاں گئے وہ لوگ	عرش صہبائی	65
یادوں کے لمس	عبدالغنی شیخ لداخی	71
لمحات کی چھاؤں میں	ارجن دیو مجبور	75
برج پریمی اور ان کا اسلوب	سید رسول پونپر	79
ایک شعلہ مستعجل	نشاط انصاری	97
کچھ یادیں کچھ تصویریں	پتامبر ناتھ درفانی	100
یادوں کے دریچے	پروفیسر پریم سنگھ	104
میرے والد	پریمی رومانی	108

صفحہ نمبر

• افسانہ نگاری :-

برج پریمی کے افسانے ——— پروفیسر عبدالقادر سروری ——— 119

برج پریمی کے افسانے ——— پروفیسر منظر اعظمی ——— 122

برج پریمی کی افسانہ نگاری ——— موتی لال ساقی ——— 127

• تصانیف :-

کشمیر کے مضامین ——— پروفیسر جگن ناتھ آزاد ——— 132

سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ——— پروفیسر محمد حسن ——— 139

جلوۂ صد رنگ ——— محمد یوسف ٹینگ ——— 140

حرف جستجو ——— پروفیسر شکیل الرحمٰن ——— 148

کشمیر کے مضامین ——— پروفیسر حامدی کاشمیری ——— 151

جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما ——— پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ——— 156

سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ——— منظر امام ——— 163

اہلِ قلم کے تاثرات ——— اوناش ایمہ ——— 166

•

پیش گفتار

یادش بخیر کئی برس پہلے کی بات ہے میں کشمیر یونی ورسٹی کی ایک سلیکشن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے سرینگر گیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر کئی دن سرینگر میں قیام کیا۔ ایک شام برج پریمی آئے۔ اپنا تعارف کرایا۔ سرخ سپید رنگ، بیضوی چہرہ، دلکش خد و خال، بھرا بھرا جسم، باتیں کرتے تو موتی رولتے۔ یہ تھے برج پریمی ان سے مل کر اور باتیں کر کے جی خوش ہوا۔ پھر کیا تھا، ہر شام شام ملاقات ہو گئی۔ برج پریمی روز آتے دیر تک بیٹھتے۔ ادبی اور سماجی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ اُن کے اخلاص کا جادو اور اخلاق کا نشہ بڑھتا گیا۔ یہ تھی برج پریمی سے میری پہلی ملاقات۔ ڈاکٹر برج پریمی کی شخصیت پر اُن کے صاحبزادے پریمی رومانی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"وہ (ڈاکٹر برج پریمی) بڑے ہنس مکھ انسان تھے۔ اُن کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں ہوتی۔ وہ بڑے نرالے انداز سے معاملے کو حل کرتے۔ وہ بھید بھاؤ کو نہیں مانتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، سب کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتے اور گھنٹوں اُن کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے..... وہ کسی کو مایوس دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کا معاملہ ہو یا ریسرچ اسکالر کی کوئی پرابلم، نجی مسئلہ ہو یا دوستوں کی کوئی بات، وہ جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے اور کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیتے۔ کبھی معاملے کے سلجھانے میں اپنا کھانا تک بھول جاتے۔ وہ اپنی صحت کی پروا کیے بغیر رات گئے تک اپنا کام کرتے رہتے۔" [1]

پریمی رومانی کی تحریر سے ڈاکٹر برج پریمی کی شخصیت اور اُن کا بھولا بھالا کردار نظروں میں پھر جاتا ہے۔ پریمی رومانی نے ڈاکٹر برج پریمی کے مزاج اور شخصیت پر اس طرح مزید روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ ماہنامہ تعمیر، جموں۔ جلد ۲۱، شمارہ ۱۵، دسمبر جنوری ۱۹۹۳ء ص ۲۲

"(وہ) لباس اور کھانے کے معاملے میں نفاست پسند تھے۔ وہ سیدھے سادے لباس کے قائل تھے۔ اُن کی ہر چیز صاف ستھری ہوتی۔ انھیں تنہا کھانا کھانے میں کبھی لذت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ گھر کے تمام افراد کو کھانے پر بُلا بُلا کر بٹھاتے۔ اور سب کے ساتھ مزے لے لے کر کھاتے۔ جب کوئی مہمان گھر میں آتا تو ان کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔ اُس دن گھر میں مارشل لا نافذ ہوتا۔ وہ اُس دن گھر کے تمام افراد کو چوکنا رہنے کو کہتے۔ ان کی ہدایت کے مطابق چیزوں کو سجایا جاتا اور انھیں جہاں کہیں کوئی کمی محسوس ہوتی، گھر کے لوگوں کو ٹوکتے۔ کبھی کبھی اُن کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا۔"[۱]

یہ تھے ڈاکٹر برج پریمی۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کے دو وسیع میدان تھے۔ ایک کشمیر کی زبان اور کلچر کا میدان، دوسرا منٹو کی شخصیت اور کارناموں کا میدان۔ ڈاکٹر برج پریمی کشمیری تھے۔ ان کی شخصیت پر کشمیر کے کلچر کا گہرا اثر تھا۔ انھوں نے اپنی علمی و ادبی جولان گاہ کے طور پر کشمیر کے کلچر کا انتخاب کیا۔ اس کی تفسیر و ترجمانی کی اور حنابندی کا حق بھی ادا کیا۔ اس راہ سے انھوں نے ہندوستان کے مشترکہ کلچر اور تہذیب و ثقافت سے اپنا ذہنی رشتہ جوڑا۔ اس کو اپنی شخصیت میں رچایا اور بسایا اور پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ادب اور کلچر کے حوالے سے انھوں نے خود ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

"مجھے پیشہ ور ناقد ہونے کا دعویٰ نہیں۔ البتہ فن، ادب، ثقافت اور آرٹ کے مختلف شعبوں سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ اور اپنا ردِ عمل اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہوں۔"

ادب اور کلچر کے حوالے سے "جلوۂ صد رنگ" اور کشمیر کے مضامین کی یاد آتی ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی کی تحریروں میں کشمیر کا تمدن مُسکراتا ہے۔ تہذیب رقص کرتی ہے اور اُس کی رُوح مشک نافہ کی طرح اپنی گرہیں کھولتی ہے۔ اس موضوع پر اُن کی تحریریں بنیادی حوالے کا کام دیتی ہیں جیسا کہ میں نے پہلے لکھا تھا، ان کی تخصیص کا دوسرا میدان سعادت حسن منٹو اور ان کی حیات و خدمات ہے۔ انھوں نے اس موضوع کا انتخاب تحقیقی مقالے کے لیے کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے ذہن پر جہاں اس کا بچپن اور

[۱] ماہنامہ "تعمیر" جموں۔ جلد ۲۱، شمارہ ۵، دسمبر جنوری ۱۹۹۳ء ص ۲۲

گھر کا ماحول چھایا ہوا رہتا ہے وہیں اس کے ذہن پر اُس کے تحقیقی کام کا گہرا اثر بھی ہوتا ہے۔ اس رُخ سے ڈاکٹر برج پریمی کی شخصیت منٹو کے شارح، ترجمان اور نقاد کی حیثیت سے اُبھرتی ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں نہ صرف یہ کہ منٹو کی شخصیت اور افسانہ نگاری کو موضوعِ نقد بنایا ہے، بلکہ انھوں نے منٹو کے خاکوں، انشائیوں، مکتوبات اور دوسرے ادبی کارناموں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے انھوں نے پورے یا سالم منٹو کو اپنی تنقید اور تحقیق کے کینوس پر اُبھارا ہے۔

منٹو کے فکر و فن کے کئی ذیلی دائرے ہیں۔ ایک دائرہ انسانی نفسیات کا ہے۔ منٹو کے اکثر افسانے انسانی نفسیات اور اُس کی پیچیدگی کے مظہر ہیں۔ دوسرا ذیلی دائرہ جنسی یا خالص جسمانی ہے اس ضمن میں اُن کے افسانوں مثلاً کالی شلوار، بُو، دھنواں، ٹھنڈا گوشت، کھول دو وغیرہ شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان افسانوں کی بنیاد پر منٹو پر فحش نگاری کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے منٹو کے فکر و فن کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور (ابتدا سے ۱۹۳۷ء تک) دوسرا دور (۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک)، تیسرا دور (۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک) اور چوتھا دور (۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک) یہ ادوار انھوں نے منٹو کے فکر و فن کے غالب اور امتیازی خصوصیات کے پیشِ نظر قائم کیے ہیں۔ کھول دو کی تصویر فسادات کے پس منظر میں اُبھرتی ہے۔ سراج الدین اور اُس کا چھوٹا سا خاندان فسادات کی نذر ہو جاتا ہے۔ اُس کی جواں سال اور خوبصورت بیٹی اُس سے جُدا ہو جاتی ہے۔ سراج الدین نام نہاد سوشل ورکروں (رضاکاروں) سے امداد کا طالب ہوتا ہے اور اپنی بیٹی کا حلیہ یوں بیان کرتا ہے۔

"(سکینہ کا) گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت۔ مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی عمر سترہ برس کے قریب ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی، بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل میری اکلوتی لڑکی ہے۔"

بوڑھے باپ سراج الدین نے اپنے بھولے پن میں اپنی جواں سال اور حسین بیٹی کا حلیہ کیا بتایا کہ رضاکار ہوس کے بھوکے بھیڑیئے بن گئے۔ انھوں نے سکینہ کو تلاش تو کر لیا۔ لیکن اپنی ہوس کی قربان گاہ پر چڑھا دیا۔ کہانی کے آخر میں باپ اور بیٹی کا ڈرامائی انداز سے ملن ہوتا ہے۔ سکینہ ہوس کاروں کے

کالے کرتوتوں کی تاب نہ لاکر اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتی ہے۔ اس پر سکتے کا عالم طاری ہے، وہ ڈاکٹر کی آپریشن ٹیبل پر لیٹی ہے۔ ڈاکٹر نے کمرے کے حبس کو دور کرنے کے لیے سکینہ کے بوڑھے باپ سے کہا کہ کھڑکی کھول دو۔ سکینہ پر سکتے کا عالم ضرور طاری تھا مگر اس نے جملے کے آخری الفاظ سن لیے منٹو نے سکینہ پر جو اس جملہ کا ہولناک ردعمل دکھایا ہے وہ اسی کا حصہ ہے منٹو لکھتا ہے:

"سکینہ کے مردہ جسم میں حرکت ہوئی بے جان ہاتھوں سے اس نے ازاربند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا، زندہ ہے، میری بیٹی زندہ ہے۔"

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔

افسانے کے ڈرامائی اختتام میں منٹو کے فن کا کلائمکس نظر آتا ہے۔ الفاظ کی مختصر سی گاگر میں معانی کا موجیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے۔ اس سمندر کی اوپری موج یہ ہے کہ بیٹی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر بوڑھا باپ اس کی زندگی سے خوش ہے اور کہتا ہے کہ "زندہ ہے میری بیٹی زندہ ہے"۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ کھول دو، کا اس کی لڑکی پر کیا طلسمی یا نفسیاتی اثر مرتب ہوا ہے؟ وہ غریب تو اپنی بیٹی کو اوپر سے دیکھ رہا ہے اور اپنی بیٹی کے جسم کی حرکت کو زندگی کی علامت سمجھ رہا ہے۔ ایک بوڑھا باپ دور سے سمجھ بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے ذہن وفکر کو فسادات اور بیٹی کے اغوا نے پہلے ہی ماؤف کر رکھا تھا۔ رہی سہی کسر بیٹی کی غیر متوقع بے ہوشی بلکہ سکتے نے پوری کر دی تھی۔ اس سمندر کی موج تہہ نشین بہت ولدوز ہے، جو سکینہ کے نفسیاتی عمل سے وابستہ ہے۔ سکینہ درندوں کی درندگی سے اس قدر متاثر ہو چکی تھی بلکہ نفسیاتی طور پر اتنی ٹوٹ چکی تھی کہ اس کے تئیں کھول دو، کا مطلب کھڑکی کھول دو یا اور کچھ نہیں تھا بلکہ ازاربند کھولنا تھا۔ اس بیکس اور ناتواں لڑکی پر کھول دو کا طلسمی جادوئی اور مسمریزی قسم کا اثر ہوتا ہے۔ اس کا یہ عمل فسادات کے پس منظر میں ہوس کاری کی ایسی گھناؤنی کتھا سناتا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اس موج تہہ نشین کے آس پاس ایک اور جھوٹے اقدار چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ ڈاکٹر کے رویے اور اسلوب عمل سے وابستہ ہے۔ مردہ جسم کی حرکت کے مخصوص نفسیاتی عمل کو ڈاکٹر سمجھتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کھول دو، کا اس مجبور اور مقہور لڑکی پر

کیوں ایک مخصوص اور گھناؤنا ردِعمل ہوتا ہے۔ اُس کی نگاہ اُس ظالمانہ پس منظر پر دُور تک تیرتی ہے۔
لیکن وہ سب کچھ سمجھ کر بے بس ہے۔ غریب تعلیم یافتہ ہو کر کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔ اس لیے منٹو نے اس
کی ساری ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو محض ایک جملے میں ادا کر دیا ہے یعنی "ڈاکٹر سر سے پیر تک
پسینے میں بھیگ گیا"۔ در اصل ڈاکٹر کا پسینہ انسانیت کا دریا ہے۔ اگر شرم ہو تو یہ سماجی بازی گر ایک
چلّو میں ڈوب کر مر سکتے ہیں مگر نہیں۔ سماج تو فحش نگاری کے الزام میں منٹو پہ مقدمہ چلاتا ہے
اسی لیے منٹو کو بہ آواز بلند کہنا پڑا تھا۔

" زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں۔ اگر آپ اُس سے واقف نہیں
تو آپ میرے افسانے پڑھیئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے، تو اس
کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے ...... میری تحریر میں نقص نہیں جس
نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ در اصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔"

یہاں سے منٹو کی مخصوص جنسی جسمانی اور نفسیاتی تحریروں پر ردِعمل کے دو اسالیب سامنے
آتے ہیں۔ ایک یہ کہ منٹو کے افسانوں کو سماجی اور تہذیبی سیاق سے الگ کر کے انھیں آزاد وجود
کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا جائے نیز اسباب و محرکات، حقیقت نگاری کے تصورات نیز ادب اور
سماج کے تعلق کو پس پشت ڈال کر محض اُوپر سے اس کے افسانوں کو فحش اور غیر فحش قرار دیا
جائے۔ غالباً قانون اور خارجی نظریوں کا یہی اسلوب اور دستور ہے۔ دوسرا یہ کہ فن کے اسباب و
محرکات کا پتہ لگا کر، ادب اور سماج، نیز ادب اور زندگی کے تعلق کی روشنی میں، حقیقت نگاری کا
سہارا لے کر تجزیہ کیا جائے۔ ظاہر ہے دونوں اندازِ فکر اور زاویہ ہائے نظر دو الگ الگ نتائج
تک لے جا سکتے ہیں۔ در اصل منٹو ایک عام انسان کی زندگی جیتا تھا۔ اُس کے تقریباً سارے تجربے ایک
عام انسان کے تجربے ہیں۔ وہ اپنے انہی معمولی معمولی تجربوں کو افسانے کی تکنیک میں بیان کرتا ہے۔ اس کے
عام تجربوں کے سرے کسبیوں کے تاریک کمروں سے شروع ہو کر فسادات کی ہولناک فضا سے گزرتے ہوئے
اقدار کے زوال تک چلے جاتے ہیں۔ منٹو نے جو کچھ دیکھا اور اپنے چاروں طرف بکھرا ہوا پایا،

اس کو اپنے قلم کی نوک تک لاکر اف ہی نہیں کیا، بلکہ اس کو بیانیہ کی خراد پر چڑھا کر اور جمالیاتی نیز ادبی احساس مہیا کر کے تخلیق نو کی حیثیت بھی دی ہے۔ یہی منٹو کے فکر و فن کی جدت، ندرت اور انفرادیت کا جواز ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے کیا خوب لکھا ہے۔

"ان افسانوں میں منٹو کا مشاہدہ اور اُن کا تخیل اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ معمولی سے واقعے کو کمال فن کاری کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بن جاتا ہے۔" [1]

مجھے بیحد خوشی ہے کہ جلد ہی ڈاکٹر برج پریمی کی منٹو پر دوسری کتاب 'منٹو کتھا' کے عنوان سے منظر عام پر آنے والی ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی تحریروں کے حوالے سے علمی انداز نظر، تجزیاتی طریق کار اور اخذ نتایج کے لیے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ مجھے دوسری خوشی یہ ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی کے ہونہار فرزند جناب پریمی رومانی اردو ادب اور کلچر کی طرف سے 'برج پریمی: ایک مطالعہ' کی شکل میں نذرانۂ محبت و عقیدت پیش کر رہے ہیں جس میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر حامدی کاشمیری، جناب کشمیری لال ذاکر، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شکیل الرحمان، پروفیسر قمر اعظمی، ڈاکٹر ظہور الدین، جناب محمد یوسف ٹینگ اور موتی لال ساقی وغیرہ کے مضامین اور مقالے شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب برج پریمی کی حیات اور شخصیت نیز ان کے فکر و فن کو سمجھنے میں کلیدی رول ادا کرے گی۔

پریمی رومانی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ برج پریمی کی تحسین شناسی کے لیے خود لکھ کر فضا کو ہموار کیا بلکہ اس دور کے مشاہیر اور نوجوان ادیبوں کے مضامین حاصل کر کے اس کتاب کی زینت کو دوبالا کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ اردو کی ادبی دنیا اور ہماری تہذیبی کائنات میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

پروفیسر عنوان چشتی
سربراہ: شعبۂ ہائے لسانیات و لسانیات
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء

---

[1] سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے (۱۹۸۶ء) سرینگر۔ ص ۲۲۸
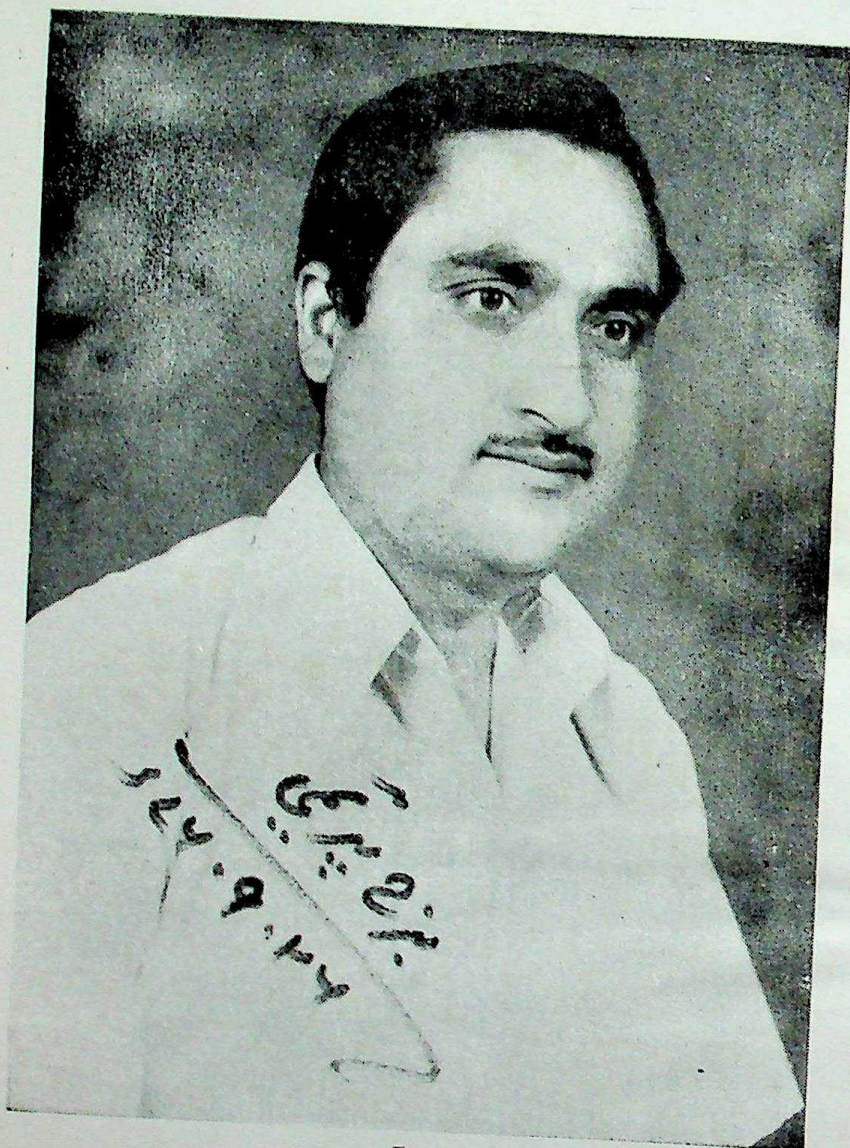
ڈاکٹر برج پریمی
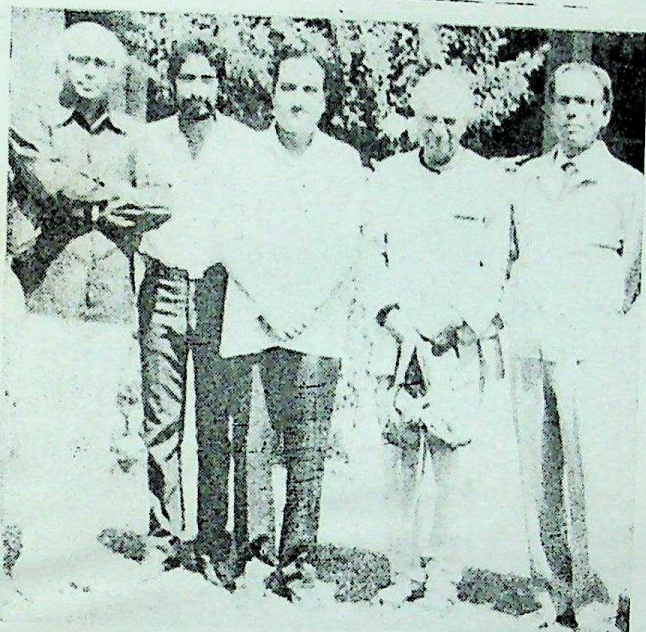
ڈاکٹر برج پریمی، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور پروفیسر شکیل الرحمن

ڈاکٹر برج پریمی، قرۃ العین حیدر، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد امان آترزدہ اور پروفیسر رئیس احمد

محمد اسد اللہ وانی

برج پریمی ——— ایک مطالعہ

اُردو زبان وادب کو ریاست جموں و کشمیر میں اپنا اثر و نفوذ قائم کیے ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف بول چال اور تحریر کے زینے طے کیے بلکہ یہ تخلیقی مراحل سے گزر کر تنقید کے ہدف بننے کی عادی بھی ہوگئی اور اس نے ریاست کے تینوں خطّوں کے عوام کے درمیان رابطے کی زبان کا اہم فریضہ بھی ادا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں اس کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی عمر بہت کم ہے مگر اس مختصر سی مدت میں اس نے اُردو ادب کے سرمایے میں کئی اہم اور قابلِ ذکر اضافے کیے۔ شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما، تاریخ نویسی، انشا پردازی، تنقید اور تحقیق غرض سب اصنافِ ادب میں یہاں کے جن ادبا، شعرا اور محققین نے اپنی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اُن میں ایک اہم اور معروف شخصیت ڈاکٹر برج پریمی کی ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کا پورا نام برج کشن ایمہ تھا لیکن عوام میں وہ برج پریمی کے قلمی نام سے مقبول تھے۔ اُن کی ولادت ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو محلہ درابی یار حبہ کدل سری نگر کے ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت میں اُن کے والد پنڈت شیام لال ایمہ کا کافی ہاتھ رہا ہے

جو اپنے وقت میں ایک قابل مدرس مانے جاتے تھے۔ انہیں شعروشاعری اور صنفِ افسانہ سے کافی دلچسپی تھی انھوں نے خود افسانے بھی لکھے اور مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ چنانچہ اُن کے اس ادبی لگاؤ کی وجہ سے برج پریمی کو بچپن سے ہی ادبی ماحول نصیب ہوا جس میں انھوں نے پرورش پائی۔

برج پریمی ابھی چھوٹے تھے کہ اُن کے والد نے اپنے آبائی مکان حبہ کدل سے رہائش ترک کر کے اپنے سسرالی مکان رنگہ ٹینگ عالی کدل میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں برج پریمی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میٹریکولیشن امتحان ڈی۔ اے۔ وی۔ اسکول مہاراج گنج سے پاس کیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں پریمی کی عمر ابھی ۱۴ برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا میٹرک پاس کرنے کے بعد انھیں اُن کے والد کی جگہ ماڈل اسکول امیرا کدل میں بحیثیت مدرس تعینات کیا گیا اور تمام گھریلو ذمہ داریاں اُن کے معصوم اور ناتواں کندھوں پر آپڑیں جنہیں انھوں نے بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ نبھایا۔ سولہ برس کی عمر میں اُن کی شادی بھی کر دی گئی جس سے اُن کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب وہ ایک طرف گھر گرہستی کے کاموں کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھا رہے تھے تو دوسری طرف ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور پرائیوٹ طور پر بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ انھوں نے بی۔ ای۔ سی۔ اور بی۔ ایڈ کی تربیت بھی اسکول کی ملازمت کے دوران میں پائی۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں کشمیر یونیورسٹی نے انھیں اردو کے نامور اور ممتاز ادیب اور افسانہ نگار "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ سنہ ۱۹۷۷ء میں وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ قبل از موت ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

سنہ ۱۹۹۰ء کے اوائل میں جب کشمیر میں کشمیری نوجوانوں کی جنگجویانہ سرگرمیاں تیز ہوگئیں تو وہاں سے تقریباً سب غیر مسلم برادری نقل مکانی کر کے ملک کے مختلف حصوں میں چلی گئی۔ مہاجرین کی ایک کثیر تعداد نے جموں اور اس کے ملحقہ علاقہ جات میں رہائش اختیار کی ان میں ڈاکٹر برج پریمی بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ جموں کے محلہ افغانان میں کرایے کا مکان لے کر عارضی سکونت اختیار کی۔ چونکہ برج پریمی کئی برسوں سے ذیابیطس کا شکار تھے انھیں گنٹھیا کی شکایت

بھی رہتی تھی اور دردِ گردہ بھی۔ اب چند برس سے وہ دل کے عارضہ میں مبتلا تھے غرض انھیں چاروں طرف سے بیماریوں نے گھیر لیا تھا مگر اس کے باوجود وہ مسلسل احتیاط اور دواؤں کے استعمال سے زندگی کی گاڑی کھینچے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹ اپریل ۱۹۹۰ء کو انھیں دل کا ہلکا سا دورہ پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر رتن لال چودھری سے معائنہ کروانے کے بعد ہسپتال داخل کیا گیا جہاں ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو دن کے ۱۲ بجکر ۵ منٹ پر انھوں نے اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر برج پریمی کا ادب سے لگاؤ ان کے والد پنڈت شیام لال ایمہ کی ادبی صحبتوں کا نتیجہ تھا جنھوں نے اپنے بیٹے کے ادبی ذوق کو بچپن سے ہی اس قدر نکھارا کہ انھوں نے چھوٹی عمر میں ہی اپنے قلم کے جوہر دکھانا شروع کیے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ان کا پہلا افسانہ "آقا" امر جیوتی میں شائع ہوا۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب کشمیر میں پریم ناتھ پردیسی کی افسانہ نگاری اپنے عروج پر تھی۔ وہ ڈاکٹر برج پریمی کے والد کے ہم جلیس تھے اس لئے پریمی پر ہمیشہ مشفقانہ نگاہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ برج پریمی کے والد کے انتقال کے بعد ان کے ادبی ذوق کو مزید نکھارنے، پروان چڑھانے اور جلا بخشنے کا کام پریم ناتھ پردیسی کی صحبتوں نے انجام دیا۔ برج پریمی نے خود اُس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے افسانے کی فن کی نزاکتوں، کردار سازی کا گُر اور کہانی کی بُنت کا فن پردیسی سے سیکھا جو ان کی کہانیوں کی تصحیح بھی کیا کرتے تھے[1]۔ اس دور میں برج پریمی نے زبان، فن اور تکنیک غرض ہر اعتبار سے بہترین افسانے لکھے۔ اُن کے افسانوں میں "ہنسی کی موت"، "میرے بچے کی سالگرہ"، "پھٹی پھٹی آنکھیں"، "ماں جب سوکھ گیا"، "فرض"، "لمحوں کی راکھ"، "یہ گیت یا مزار"، "زاویے"، "قبا کے ایک طرف"، "راجوے سپنوں کی شام"، "ایک پھول ایک کلی"، "اُجڑی بہاروں کے اُجڑے پھول" اور "ٹیس" درد کے قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کا ابھی تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے مگر بیشتر افسانے "بیسویں صدی" (دہلی)

---

[1] کشمیر کے مضامین از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۷۳۔

راہی (جالندھر) مصور (پٹنہ) پگڈنڈی (امرتسر) دیش (سرینگر) استاد (سرینگر) جیوتی (سرینگر) شعلہ و شبنم (دہلی) سب رنگ (بمبئی) فلمی ستارے (دہلی) اور ہمارا ادب (سرینگر) جیسے اہم ادبی رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی نے جس دور میں افسانے لکھے وہ ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ وادیٔ کشمیر میں اس تحریک کے بانی پریم ناتھ پردیسی تھے جن کے زیر اثر برج پریمی کی کہانیوں میں بھی ترقی پسند رجحانات کارفرما ہے۔ انھوں نے کشمیر کے پسماندہ عوام کے ساتھ برتے جا رہے رویئے ناانصافی، ظلم و ستم، طبقاتی کشمکش اور سماجی نابرابری کو موضوع بنا کر فن کارانہ چابکدستی سے افسانوں کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان میں پختگی بیان میں حلاوت اور اسلوب میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ تحقیق و تنقید اور افسانوی زبان کا فرق بخوبی جانتے ہیں۔ "میرے بچے کی سالگرہ" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایک نوجوان باپ بننے کی خبر سن کر محسوس کرتا ہے کہ وہ بڑھاپے کے توسن پر سوار ہو گیا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ دیش (سرینگر) مارچ ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا۔

"میرا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔ میرے ماتھے کی معصوم شکنیں گہری ہو گئی تھیں۔ غم و تردد فضاؤں سے اُبل کر میرے خوبصورت چہرہ پر پھیل گیا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے آسمانوں کے دریچے کھول کر بڑھاپا آہستہ آہستہ میرے بالوں کی اور بڑھ رہا ہے۔"

"سپنوں کی شام" کا یہ اقتباس بھی قابل مطالعہ ہے جس میں ایک دیہاتی لڑکی 'ساجی' اپنے شوہر 'سلامہ' کو ندی میں بہنے سے بچاتی ہوئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے حالانکہ ایک دفعہ ساجی کو گاؤں کے ایک ماسٹر نے مٹی کے تودے کے نیچے آنے سے بچایا ہوتا ہے۔ ساجی کی قبر دیکھ کر ماسٹر کے دلی جذبات کو برج پریمی نے لفظوں کے یہ پیکر عطا کیئے ہیں۔

"ادم پورہ کی رہنے والی ایک حسین لڑکی کا مزار ہے جس نے اخروٹوں اور ناشپاتیوں کے درختوں کی چھاؤں میں ایک چاندنی رات مجھ سے عہد و پیمان کیئے تھے اور جس کو

گھنیرے بالوں میں منہ چھپا کر میں نے ایک انجانی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔"

برج پریمی کے افسانوں پر پروفیسر عبدالقادر سروری نے یہ تبصرہ کیا ہے:۔

"برج کشن افسانوں میں کشمیر کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کشمیری پس منظران میں زیادہ نمایاں نہیں[4]" سروری مزید لکھتے ہیں:۔

"برج پریمی بھی اپنے عہد کی ترقی پسندی سے متاثر ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں بھی مہاجن، ٹھیکہ دار، لمبی توندوں کے ڈراؤنے سائے، سارے عناصر موجود ہیں[5]"۔

برج پریمی کو افسانے کی ڈگر سے ہٹا کر تحقیق و تنقید کی راہ پر ان کا تحقیقی مقالہ "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" لے آیا۔ انھوں نے اس موضوع پر اس قدر جانفشانی اور جگر کاوی سے کام کیا کہ اردو کے ناقدین اور محققین نے اس کی اہمیت اور افادیت تسلیم کی ــــ اس سلسلے میں اُن آرا کا مطالعہ دلچسپ اور قابل توجہ ہے جن کا اظہار اس کتاب کے مطالعے کے بعد کیا گیا ہے۔

"میرے خیال میں کم از کم ہندوستان میں منٹو پر ایسی بھرپور کتاب شائع نہیں ہوئی ہے..... آپ نے تو منٹو مرحوم کے بارے میں ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ منٹو پر کام کرنے والا کوئی طالب علم کوئی اہل قلم اس صحیفے کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔" (پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

"منٹو پر ایسی جامع کتاب اب تک اردو ادب میں نہیں لکھی گئی ہے۔ منٹو پر آئندہ بھی تحقیقی کام ہوگا، لیکن آپ کا یہ مقالہ ہمیشہ بنیاد کا کام دے گا۔" (پروفیسر قمر رئیس)

"منٹو کی شخصیت اور فن پر ان کی کتاب بنیادی حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔"

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)۔

"پریمی نے تنقید کے تواریخی اور ساختیاتی انداز نظر کے امتزاج سے منٹو کی شخصیت اور ان کے فن کا ایک بے تعصب مطالعہ پیش کیا ہے۔ (پروفیسر حامدی کاشمیری)

---

[4]، [5]۔ کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ) از پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ص ۱۹۷، ۱۹۸۔

"واقعی آپ نے حالات و واقعات جمع کرنے میں بڑی کد وکاوش سے کام لیا ہے اور منٹو کے فن کا جائزہ نہایت ہی شگفتہ اسلوب نگارش میں پیش کیا ہے۔ ہر بات کو توقع سے زیادہ پایا۔"

(پروفیسر مسعود حسین خان)

وادیٔ کشمیر کے محقق اور ادیب محمد یوسف ٹینگ رقم طراز ہیں۔

"یہ بات کسی شک و شبہے کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ منٹو کو اپنے دور کے حوالے میں دیکھنے اور اُن کی ذہنی وفاداریوں کے سوتے دریافت کرنے میں پریمی کے کام سے اغماض برتنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔[1]"

غرض منٹو کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی نے جس زاویے سے کام کیا ہے اُس کی ادبی حلقوں میں بے پناہ اور نمایاں پذیرائی ہوئی۔ "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" کے بعد پریمی نے اپنی تمام تر توجہ تحقیق و تنقید کی جانب مبذول کی اور یکے بعد دیگرے کئی اہم کتب شایع کر کے جہاں اُردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا، وہاں کشمیری نژاد ہونے کی وجہ سے کشمیر کے تئیں اپنی ذمہ داریوں اور وفاداریوں سے سبکدوش ہونے کی کامیاب سعی کی ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ برج پریمی کا تحقیقی مقالہ "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" ۱۹۷۶ء میں مکمل ہوا مگر اسے شایع ہونے میں دس سال کا عرصہ لگا۔ اس دوران میں ان کے مضامین کے دو مجموعے شایع ہو چکے تھے اس وقت بحیثیت مجموعی برج پریمی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

مطبوعہ:۔ حرفِ جستجو ۱۹۸۲ء، جلوۂ صد رنگ ۱۹۸۵ء، سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ۱۹۸۶ء، ذوقِ نظر ۱۹۸۷ء، چند تحریریں ۱۹۸۸ء، کشمیر کے مضامین ۱۹۸۹ء،

زیرِ طباعت:۔ پریم ناتھ در کے منتخب افسانے، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، منٹو کتھا، غیر مطبوعہ:۔ پریم ناتھ پردیسی۔ عہد، شخص اور فن کار، اوپندر ناتھ اشک کے خطوط، نئی تحریریں، اُردو ادب میں کشمیری پنڈتوں کی خدمات، صمد میر۔ شخص اور فن کار۔ ان کے علاوہ ایک

---

[1] جلوۂ صد رنگ از ڈاکٹر برج پریمی (پیش گفتار از محمد یوسف ٹینگ) ص ۱۱

پروجیکٹ کے تحت ادبی ڈگر سے ہٹ کر انھوں نے تعلیم بالغاں کے سلسلے میں مرغ بانی اور شجرکاری جیسی معلوماتی اور کار آمد کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی کی تصانیف کی ادبی قدر و قیمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جن مختلف اداروں نے انھیں انعامات عطا کیے اُن میں آل انڈیا اُردو ہندی سنگم ایوارڈ ۱۹۷۶ء۔ یو۔ پی اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۶ء، جموں و کشمیر کلچرل اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۶ء اور مغربی بنگال اُردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۷ء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی کا صحافت کے ساتھ بھی تعلق تھا۔ انھوں نے ایک عرصہ تک روزنامہ نوجوان میں "نگ دیپ" کے فرضی نام سے ایک مستقل کالم "قاشیں" لکھا جو کافی مقبول ہوا۔ وہ جیوتی اور مارتنڈ میں بھی لکھا کرتے تھے مختلف ادوار میں "دیش"، "استاد"، "ہمارا استاد"، "گاشہ"، "آگر"، "آگاہی"، "بازیافت"، "سہیل" اور "صدف" جیسے ادبی رسائل کے حلقہ ادارت سے بھی اُن کی عملی وابستگی رہی۔

ڈاکٹر پریمی کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور صحیح سمت عطا کرنے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا کافی ہاتھ رہا ہے۔ ابتدا میں بقول اُن کے وہ پروفیسر سروری کی زمانہ سازی بزدلی[1] اور اقرباء نوازی کی وجہ سے بدظن اور دل برداشتہ ہو گئے تھے کیونکہ ان کے قریب ہونے کے باوجود نہ تو وہ کہیں لیکچرار تعینات ہوئے اور نہ ہی مسلسل کوششوں کے باوصف کئی برس تک انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ مل سکا تھا مگر اس کے باوجود سروری کے اخلاص اور ہمدردی نے انھیں اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ دونوں کا لگ بھگ چھ سال تک تعلق خاطر رہا۔ اس دوران میں انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ بھی ملا۔ اور ساتھ ہی انھوں نے سروری کے اُس تحقیقی کام میں ہاتھ بٹانا بھی شروع کیا جس کا نتیجہ کشمیر میں اُردو کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے دوران میں ڈاکٹر پریمی نے پروفیسر سروری کے ساتھ جس طرح شب و روز محنت کی اور کشمیر کے اطراف و اکناف کا دورہ کیا اُس کا ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب ذوقِ نظر میں شامل مضمون عبدالقادر سروری میں تفصیلی ذکر کیا ہے

---

[1] ۔ ذوقِ نظر از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۱۲۴۔

"کشمیر میں اردو" پروفیسر عبدالقادر سروری کی آخری تصنیف ہے جسے ریاستی کلچرل اکاڈمی نے تین حصوں میں شائع کیا ہے۔ یہی وہ تحقیقی پروجیکٹ تھا جس کے مواد کی تلاش و جستجو میں ڈاکٹر برج پریمی نے پروفیسر سروری کے ساتھ ایک معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ سروری صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے گفتگو کرتے تھے اور پریمی کے ذمہ گفتگو کے نوٹس (NOTES) لینا تھا جنہیں بعد میں وہ صاف کرکے سروری کے حوالے کرتے تھے تاکہ وہ حسب ضرورت اُن سے کام لے سکیں۔ کشمیر میں اردو پروجیکٹ پر کام کرنے کے دوران میں برج پریمی کو کشمیر کے سبھی ادبا و مشاہیر سے ملنے، قریب سے دیکھنے اور سروری کی صحبت میں رہ کر تحقیق و تنقید کے اسرار و رموز سیکھنے کے مواقع ملے جس کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔

"سروری صاحب نے اُستاد نہ ہوتے ہوئے بھی بہت قلیل عرصہ تک ہی سہی میری اُستادی کا حق ادا کیا اور تحقیق کے رموز سکھائے جن سے میں آج تک روشنی حاصل کر رہا ہوں۔"[1]

پروفیسر عبدالقادر سروری کو بھی ڈاکٹر برج پریمی کی صلاحیتوں کا احساس تھا جس کا اندازہ ان کے ایک خط کی اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے۔

"..... میں نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا تھا خدا کرے آپ کو مل گیا ہو۔ آپ جو دلچسپی اس کام سے لے رہے ہیں، اس کے لیے مشکور رہوں۔ اصل میں یہ آپ ہی کا کام ہے اب کوئی چیز ملے تو اسے اپنے یہاں محفوظ رکھیے میں انشاء اللہ ۲۸ فروری کو سرینگر لوٹوں گا اور سب حاصل کر لوں گا ....."[2]

مختصر یہ کہ سروری کی سنگت میں رہ کر برج پریمی کو تحقیق و جستجو کا جو شوق پیدا ہوا تھا وہ آخری دم تک قائم رہا۔ گھر میں ہوں یا باہر کسی ادبی نشست میں یاروں کی محفل میں ہوں یا چہل قدمی کر رہے ہوں خلوت ہو یا جلوت ہر وقت ادب و تحقیق کی باتیں ہوتی رہتیں۔ اردو ادب اور

---

[1]،[2]۔ ذوق نظر از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۱۲۵، ۱۳۶۔

کشمیریات ان کا اوڑھنا بچھونا تھا کشمیر اور کشمیریات کے کئی مستور پہلوؤں کی انھوں نے غیر جانبدارانہ نقاب کشائی کی ہے۔ اس ضمن میں محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں۔

"کشمیر شناسی کا جو پیرایہ اس نے اختیار کیا ہے وہ کشمیریوں کے بڑھتے ہوئے قومی شعور اور انفرادی اعتماد کے ساتھ ساتھ اردو قاری کے لیئے کچھ انوکھے ناآشنا مگر بے حد شاندار مناظر کی کھڑکیاں کھولتا ہے۔۔۔۔ کشمیر کی تاریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔"[1]

ڈاکٹر برج پریمی ایک سنجیدہ اور باصلاحیت ادیب، باذوق اور صاحب نظر نقاد، ایک محنتی اور ذمہ دار محقق اور ایک ایماندار اور پرخلوص استاد تھے۔ ان کی تخلیقات خواہ تنقید سے متعلق ہوں یا تحقیق سے، اردو زبان و ادب سے متعلق ہوں یا کشمیری زبان و ادب سے، تاریخ و تمدن سے متعلق ہوں یا تہذیب و ثقافت سے ان میں فلم کی بات کہی گئی ہو یا عوامی زندگی کی غرض یہ کہ کوئی پہلو کیوں نہ ہو تمام مضامین موضوعات کی بوقلمونی اور خشکی کے باوجود ان کے اسلوب نگارش، طرز اظہار اور طریقہ استدلال کی بدولت ایسی حلاوت و شیرینی میں ڈھل جاتے ہیں کہ قاری کی طبیعت بوجھل یا گرانباری کا شکار نہیں ہوتی۔ ان کی نثر شگفتہ، رواں، آسان اور عام فہم مگر زوردار اور پُر اثر ہے انھوں نے ابتدا میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا بعد ازاں ایک نقاد اور محقق کے طور پر بھی اپنی شخصیت تسلیم کروائی انھوں نے اردو زبان و ادب کے علاوہ کشمیر اور بیرون کشمیر کی شخصیات کے ساتھ ساتھ دوسرے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور جاندار تحریریں پیش کیں۔ حرف جستجو سے لے کر کشمیر کے مضامین تک بشمول سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ان کی سب تصانیف ان کے وسعت مطالعہ کشادہ نظری، عمیق مشاہدہ، تبحر علمی محققانہ ژرف نگاہی اور کشمیر کے تئیں جذبہ وفاداری اور حب الوطنی کا بین ثبوت ہیں۔ انھوں نے اپنی ان تصانیف میں اردو و ادب فلم اور ان سے

---

[1] جلوۂ صد رنگ از ڈاکٹر برج پریمی (پیش گفتار از محمد یوسف ٹینگ) ص ۱۱، ۱۲، ۱۳

وابستہ بلند قامت ادبی شخصیات، جموں وکشمیر میں اردو ادب کشمیر کی تواریخی صحافت، کشمیری ادب فن تعمیر، ثقافت، کشمیر کی شخصیات، ادبی تحریکات اور اسطور سے متعلق محنت شاقہ اور دیدہ ریزی سے کام لے کر معلومات کا بیش بہا گنجینہ فراہم کیا ہے۔ ان کی تحریریں بے تعصبی، وسیع المشربی اور کشادہ نظری کی آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے نقد و احتساب میں کسی قسم کی جانبداری سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ہمیشہ کھری کھری بات کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں توازن و اعتدال پایا جاتا ہے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری برج پریمی کی نگارشات کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"..... برج پریمی کی نگارشات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی تحقیقی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے صرف معلومات اور اعداد و شمار جمع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کو نقد و احتساب کی کسوٹی پر بھی پرکھتے ہیں۔ اس طرح سے ان کی تحقیق بعض نام نہاد محققین کی طرح بے فیض بار برداری ہو کر نہیں رہ جاتی، بلکہ ایک بامعنی اور ترسیلی کارگزاری بن جاتی ہے۔ وہ جانفشانی سے واقعات کو جمع کرتے ہیں اور پھر ان کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے تاثرات کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے استخراجی عمل کو روا رکھتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان کا طرز اظہار حقیقت و استدلال کی خشک اور سرد سطح پر منجمد نہیں ہو جاتا بلکہ شعری اور افسانوی حرارت اور لطافت سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پریمی کے دل میں ایک شاعر بسا ہوا ہے اور ان کے اندر کا کہانی کار جس سے ہم ان کی ابتدائی زندگی میں متعارف ہو چکے ہیں زندہ ہے۔ اس طرح سے ان کی تحقیق تنقیدی معروضیت بھی رکھتی ہے اور افسانوی لذت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر مقالہ ایک خوان نعمت کی طرح سامنے آتا ہے اور قاری کو بقدر لب و دندان کام نکالنے کی دعوت دیتا ہے۔"[1]

برج پریمی کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے اور افسانے تحریر کرنے

[1] کشمیر کے مضامین از ڈاکٹر برج پریمی (پیش لفظ از ڈاکٹر حامدی کاشمیری) ص ۱۲+

یں گزرا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ تنقید و تحقیق کی جانب متوجہ ہوئے تو ان تحریروں میں بھی کہیں کہیں وہ افسانوی رنگ بکھرتے رہے جو ان کے تصوّرات و خیالات کے روزنوں سے بے اختیار جھانکتے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے اپنا منصب فراموش نہیں کیا اور انھوں نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ توازن و اعتدال قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے تاکہ قاری کو کسی قسم کا بوجھل پن محسوس نہ ہو۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری جن کی صلاحیتوں کا اعتراف ڈاکٹر برج پریمی نے ایک دوست، مفکر اور رہنما کی حیثیتوں میں کیا ہے برج پریمی کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"برج پریمی کے قلم میں روانی ہے ان کی تحریریں پڑھ کر زبان کی گرانباری یا ثقالت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ دل کو موہ لینے والی سادگی، ملائمت اور شائستگی کا احساس ہوتا ہے۔"[۱]

ڈاکٹر برج پریمی کا ایک موضوع پر باقاعدہ تحقیقی کام "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" ہے۔ اس کے علاوہ شائع شدہ دوسری تصانیف مختلف مضامین کے مجموعے ہیں ان میں سے یہاں چیدہ چیدہ مضامین کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا جنہیں مختلف موضوعات کے تحت یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اُردو زبان و ادب :۔ پریم چند اور تحریک آزادی، پریم چند کے تکنیکی تجربے، منٹو کے خطوط، پردیسی اور اُن کے افسانے، اُردو کے چند قد آور افسانہ نگار، پریم چند اور دیہات، مختصر افسانہ اور خواتین، اُردو کہانی کے بدلتے ہوئے رنگ، منٹو فکر و فن کے چند پہلو، سردار جعفری اور قومی رواداری، کشمیر میں اُردو تنقید، جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ، جموں و کشمیر میں صحافت، تحریک آزادی اور اُردو ادب، اُردو فکشن اور قومی وحدت، قومی وحدت اور اُردو شاعری،

شخصیات :۔ عبدالقادر سروری، نندہ لال کول طالب کاشمیری، گوبند کول، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ دھر، حامدی کاشمیری، سعادت حسن منٹو۔

کشمیر :۔ کشمیر۔ فن تعمیر، مارتنڈ۔ سوریہ مندر، برنیر اور کشمیر، للہ دید کی شاعری،

۱۔ کشمیر کے مضامین از ڈاکٹر برج پریمی (پیش لفظ از ڈاکٹر حامدی کاشمیری) ص ۱۳۔

کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک، کشمیر۔ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں، کشمیر۔ رہن سہن اور لباس،

فلم :۔ سعادت حسن منٹو اور نگار خانے، سعادت حسن منٹو اور ہندوستانی فلم ۔

راجندر سنگھ بیدی اور ہندوستانی فلم، ہماری فلموں میں ہندوستانیت، ہندوستانی فلم میں خواجہ

احمد عباس کا حصہ، نغموں کا سوداگر۔ ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر بحیثیت نغمہ نگار، اوپندر ناتھ

اشک اور ہندوستانی فلم۔

انشائیے اور خاکے :۔ باتیں توہمات کی، باتیں استدلال اور قوت برداشت کی

قدیم اخلاقی قدریں اور جدید سماجی تقاضے، وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی۔ تیسر کشمیر،

ہمارے میکدے کا بجھ گیا اک اور چراغ۔ پریم ناتھ بزاز، دو دِ چراغِ خاموش۔ کشپ بندھو

جلتی بجھتی یادیں۔ سوم ناتھ سادھو، بزمِ احساس میں قائم ہے خلا تیرے بعد۔ کلدیپ راعنا،

یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ ڈاکٹر برج پریمی نے بھی اپنی تحریروں کو مختلف عنوانات کے تحت کتابوں میں شامل کیا ہے چونکہ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے اس لئے دستیاب مضامین کو ان کے موضوع کے اعتبار سے ہی شایع کیا گیا جس طرح سے میں نے انہیں تقسیم کیا ہے یہ صورت تمام تصانیف کو سامنے رکھنے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو کسی مرحلے پر وہ ایسا سوچتے، لیکن جو نقش ہمارے رنگ رنگ اس وقت ان تصانیف میں موجود ہیں، وہ اپنی اہمیت، افادیت اور دلچسپی کی نئی دنیا لئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی کی نگارشات میں جس سادگی، روانی، تیسرنی اور شگفتگی کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"اردو کے قلم کاروں نے ہر اس دور میں اپنے قلم کی تمام توانائیوں کے ساتھ جہاد کیا ہے جب ظلم نے، جبر نے، منافرت نے بغض و عناد نے کسی رنگ یا نسل یا مذہب کی آڑ لے کر اپنے خونین پنجوں کی طاقت آزمائی ہے لیکن اس سے بڑھ کر حق بات یہ ہے کہ اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کا نام ہے۔ اس کے خمیر اور اس کی سرشت میں شیخ و

برہمن کو شیر و شکر کرنے والا جذبہ ازلی اور ابدی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں رہنے بسنے والے رنگ برنگ رنگوں اور نسلوں اور فرقوں کے لوگوں نے اس کی آبیاری کی ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس نے ہندی تہذیب کی مانگ میں سیندور بکھیر دیا ہے جس نے تعصبات کے حصار کو توڑ کر محبت، بھائی چارے اور انسان دوستی کی قندیل فروزاں کی مختلف زبانوں کے الفاظ کو جذب کر کے شہد کی ندیاں بہا دیں۔ ہندوستان میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے مغرب اور مشرق شمال اور جنوب کے گوشوں کو ملا دیا اور ہندوستانی سماج میں جہاں تک اس کی البیلی آواز پہنچی کدورت اور نفرت کے زہر پر تریاق رکھ دیا۔"[1]

برج پریمی کی تحریروں میں شاعرانہ پیکر تراشیاں افسانوی لذت و حرارت، سادہ اور عام فہم زبان قاری کو جہاں گرانباری اور ثقالت کا احساس نہیں ہونے دیتی وہاں یہ اس کے دل میں ایک انجانی سی گدگداہٹ پیدا کرتی ہے۔ یہ نثر پارہ ملاحظہ ہو:-

"جہاں میں رہتا ہوں اسے صدیوں سے دھرتی کا سورگ کہا جاتا ہے۔ اپسراؤں کا یہ دیس تہذیب کی صبح سے اپنے ملکوتی حسن اپنے رنگ اور اپنے نور سے سورگ کے انسانی تصور کا پیکر ہے۔ یہ وہ خطۂ ارضی ہے جہاں کے صد رنگ جلوؤں نے صدیوں سے سیلانیوں کو بہلایا ہے۔ یہاں گیان و عرفان کے کتنے سوتے پھوٹے ہیں، آگہی و بصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں اور عقل و عشق کے کتنے مرحلے انجام کو پہنچے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر یہ سب داستانیں منقش ہیں۔

"جہاں میں رہتا ہوں وہاں کی صبحوں اور شاموں پر بنارس کی صبحیں اور اودھ کی شامیں قربان ہیں۔ یہاں کی ہر سحر یہاں کی سحر ہے اور یہاں کی ہر شام یہاں کی شام ہے۔ ان صبحوں اور شاموں کی ہر شبیہ اور ہر رنگ بے مثال ہے۔ اس کی ہم سری کا

---

[1] چند تحریریں از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۱۹:

بادہ کسی اور شبیہ کسی اور رنگ میں نہیں۔ یہ سرزمین شاعر کا تخیل ہے اور مغنی کا ساز۔ یہ حسن پرستوں کی عبادت گاہ ہے اور عقل و جذبے کی آماجگاہ۔ یہاں قدرت اپنی تمام حشر سامانی بے نقاب کرتی ہے اور انسانی عقل جودت ذہن کے جلوے بکھیرتی ہے.......... میں صدیوں سے اس سرزمین میں رہتا چلا آیا ہوں میں اس کا انگ انگ اور روم روم ہوں۔ میری رگ رگ میں یہی عطر بیز ہوائیں یہی تقدس و طہارت، قدرت کی مہانتا کے یہی رنگ کیسر کی کیاریوں کا یہی سہاگ، علم و فن اور عقل و دل کی یہی خوشبو ہے، مجھے ازل سے ان پر اسرار سناٹوں کو سمجھنے کی تلاش ہے جو یہاں کے ہر پربت، ہر جنگل، ہر جھیل، ہر پھول اور نیلے آکاش پر آہستہ خرامی سے اڑتے ہوئے ہر با دل میں محسوس ہوتے ہیں۔[1]"

ڈاکٹر برج پریمی کا یہ اسلوب ان کی تنقید میں بھی اسی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

"منٹو کے فنی کمال کا ایک اور راز اُن کے اظہار و ابلاغ کے اسلوب میں چھپا ہوا ہے اُن کی زبان کا اسٹائل ان کی تشبیہات اور استعارے بے مثال ہیں۔ وہ شاعری میں یقین نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں شاعرانہ اظہار نہیں ملتا۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں بلیغ استعاروں اور تشبیہوں کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں جس طرح ان کے موضوعات زندگی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح ان کی زبان اور اُن کی استعمال کی ہوئی تراکیب نادر ہیں اور اپنے موضوع کے ساتھ قریبی تعلق رکھتی ہیں۔۔۔۔[2]"

ڈاکٹر برج پریمی ایک خوش پوش سیدھے سادے سچے اور پُر خلوص انسان تھے۔ انھوں نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں مسلسل جدوجہد کرتے ہوئے ساری عمر صعوبتوں اور پریشانیوں میں

---

[1] جلوۂ صد رنگ از ڈاکٹر برج پریمی ص ۱۷، ۱۸، ۱۹۔

[2] سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۲۷۱۔

گزاری اور ہر پریشانی کا ہنسی خوشی اور پامردی سے مقابلہ کیا۔ اُن کے چہرے پر ہر آن بشاشت اور لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم رقص کرتا رہتا تھا۔ ان کے بیٹے پریمی رومانی کا کہنا ہے کہ وہ مذہب کے سخت پابند تھے لیکن میں نے ان میں کسی قسم کا مذہبی کٹرپن نہیں دیکھا۔ وہ اپنی نجی زندگی میں کیا تھے؟ میں بتا نہیں سکتا مگر دوسرے مذاہب کے تئیں اُن کا احترام ان کی وسیع المشربی کی کھُلی دلیل ہے۔ وہ مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ نفاست و شرافت اور عاجزی و انکساری ان کی سرشت میں تھی۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی جو ہر وقت کسی شے کی تلاش میں رہتی تھی وہ کم گفتار تھے مگر جب کسی موضوع پر بات کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ زمانے کے بہت سرد و گرم دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کی ہر بات سنجیدہ اور معنی آفرین ہوتی تھی۔ جب گھر سے باہر نکلتے تھے ہاتھ میں ضرور بریف کیس یا بیگ ہوتا، چال میانہ ہوتی اگر کوئی دوست یار ساتھ ہوتا تو دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ان سے گفتگو بھی کرتے اور ان کی دلجوئی بھی اور اگر اکیلے ہوتے تو خیالات کی پنہائیوں میں گم دکھائی دیتے۔ وہ ہر ملنے والے سے ایسے تپاک سے ملتے کہ اجنبی کو بھی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔

محمد الدین فوق کے بعد شائد برج پریمی پہلے شخص ہیں جنہوں نے کشمیر کے ادبی ثقافتی اور تہذیبی خزینوں کو منظرِ عام پر لانے کی بے لاگ کوشش کی۔ وہ وادیٔ کشمیر کے ایک ایسے ادیب تھے جن کا وسیلۂ اظہار صرف اور صرف اُردو تھی۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن کشمیر اور کشمیریات کی بازیافت تھا۔ وہ کشمیر کے ادب، یہاں کی تہذیب، ثقافت اور تاریخ کے نئے ابعاد کی نقاب کشائی کر کے انہیں اُردو نثر کے وسیلے سے دُنیا کے وسیع تر حلقے تک[1] پہنچانا چاہتے تھے۔ جس میں وہ بلاشبہ کامیاب رہے مگر وہ اس سے مطمئن نہ تھے جیسا کہ انھوں نے خود کہا تھا۔

میرا یہ سفر یہیں ختم نہیں ہوتا۔
میری پیاس یہیں نہیں بجھتی۔
میں اپنا راستہ ٹٹول ٹٹول کر تراشنے کی کوشش برابر کر رہا ہوں میں کس حد تک

---

[1] کشمیر کے مضامین از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۹۱۶

اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں گا، جو میری زندگی کا سب سے ارفع اور سب سے بڑا مشن ہے۔ کشمیر کی تلاش! کون جانے؟"[1]

اور سب سے بڑی سچائی یہی ہے کہ حقیقت کی کسی کو خبر نہیں کشمیر کی تلاش جن کی زندگی کا "سب سے ارفع اور سب سے بڑا مشن" تھا جنہیں کشمیر کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا وہ کشمیر سے دور عالم مہجوری میں ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے واپسی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ انھیں کشمیر سے عشق تھا اور اس عشق کو تازگی و تابندگی عطا کرنے اور استحکام بخشنے کی خاطر جو رسم وفاداری انھوں نے نبھائی وہ تا ابد دائم و قائم رہے گی۔ عشق کو تو دوام حاصل ہے!

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

●

---

[1] کشمیر کے مضامین از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۱۱

کشمیری لال ذاکر

درد کا امانت دار۔ برج پریمی

کشمیر پر ایک بھرپور ناول لکھنے کا منصوبہ تھا۔

یوں تو قریب قریب میرے ہر ناول میں میری اُس حسین وادی کا ذکر ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال گزارے تھے لیکن بہت دنوں سے یہ تمنا تھی کہ ایک بھرپور ناول لکھوں جس میں وادیٔ کشمیر کی جنم سے لے کر آب تک کی داستان درج ہو اور وہ سب دور موجود ہوں جن میں سے یہ وادی گزر کر اس منزل پر پہنچی ہے جس کی ایک الگ کہانی لکھی جا سکتی ہے ضروری تھا کہ دو تین بار کشمیر جاؤں اپنی پرانی یادیں تازہ کروں اور اُن جگہوں کی دوبارہ زیارت کروں جن کی تاریخی، شناختی اور سماجی اہمیت ہے۔ ان درس گاہوں کو بھی دیکھوں جہاں میں نے علم کی روشنی سے فیض حاصل کیا تھا۔ اُن محلوں اور گلیوں میں بھی گھوموں جن کے پتھروں کا لمس ابھی تک میرے پاؤں میں زندہ ہے۔ اُن دوستوں اور بزرگوں سے بھی ملوں جن کی رفاقتیں اور دُعائیں میرے شریکِ حال رہ چکی ہیں۔ اُن دنوں میرے دوست پروفیسر رئیس احمد کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ہی قیام کروں اور یونیورسٹی کی لائبریری کو بھی دیکھوں اور یونیورسٹی کے دوستوں کی مدد سے ہی وادی میں گھوموں پھروں اور ناول کے لیے میٹریل اکٹھا کروں۔ رئیس صاحب کی دوستی میرے بڑے کام آئی۔ انھوں نے میری ہر طرح سے مدد کی اور مجھے یونیورسٹی کے رجسٹرار جناب امین صدیقی

کے حوالے کر دیا جن سے میری پرانی وابستگی تھی۔ ان دنوں ڈاکٹر آل احمد سرور اور پروفیسر شکیل الرحمٰن بھی وہیں تھے۔ حامدی کاشمیری، رحمان راہی، غلام رسول نازکی، ریاض پنجابی اور بہت سے دوسرے دوستوں سے ملاقات ہوئی جنھوں نے میرے کام میں پورے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

لیکن جن دوستوں نے اپنے آپ کو پوری طرح میرے سپرد کر دیا، وہ تھے ڈاکٹر محمد زمان آزردہ، اور ڈاکٹر برج پریمی۔ ڈاکٹر زمان آزردہ سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات ایک اُردو کانفرنس کے سلسلے میں چنڈی گڑھ میں ہوئی تھی۔ برج پریمی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ زمان بے تکلفی سے اُسے "امیہ" کہتا تھا، کیونکہ یہی اس کی ذات تھی۔ میں نے کبھی اُسے برج پریمی کو کسی اور طرح مخاطب کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

اس شام برج پریمی پہلی بار زمان آزردہ کے ساتھ مجھے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ملنے آیا۔ وہ بڑی محبت سے ملا اور بڑی عزت سے پیش آیا۔

"میں تو آپ کا فین ہوں ذاکر صاحب۔ آپ کی کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں۔"

"اس کے لیے شکریہ۔"

"میں آج اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

"اس خوش قسمتی میں مجھے بھی شامل کر لو یار۔ خود غرضی سے کام نہ لو۔" زمان آزردہ بولا۔

"آپ کی انہی اداؤں پر تو ہم لوگ مرتے ہیں۔" برج پریمی کا جواب سن کر زمان آزردہ نے سگریٹ سلگایا اور پھر گیسٹ ہاؤس والوں کو چائے لانے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر میں بڑی ذائقہ دار چائے آگئی۔

ہم تینوں چائے پیتے رہے اور گفتگو بھی کرتے رہے۔

"میں زیادہ دیر تک پیدل نہیں چل سکتا۔" برج پریمی نے کہا۔

"دراصل اس کا پاؤں بھاری ہے۔" زمان آزردہ نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

"تو کل ان کا سب سے پہلے چیک اپ کروایا جائے" میں نے کومنیٹ کیا۔

"وہ تو یہ کروا چکا ہے" زمان بولا

"میڈیکل رپورٹ کیا ہے؟"

"یہی اس کا پاؤں بھاری ہے۔"

زمان آزردہ کے اس جواب پر ہم تینوں دیر تک ہنستے رہے۔

رات کے دس بجے کے قریب زمان آزردہ اور میں برج پریمی کو یونیورسٹی کیمپس میں اس کے کوارٹر تک چھوڑنے گئے۔ میڈیکل رپورٹ واقعی سچ تھی۔ اُسے چلنے پھرنے میں کافی دقت محسوس ہوتی تھی۔ زیادہ چلنے سے اس کے پاؤں سوج جاتے تھے۔ اس سے ہاتھ ملانے اور اجازت لینے سے پہلے میں نے کہا۔

"کیا کل صبح تم مجھے کھیر بھوانی لے جا سکتے ہو؟"

"کل اتوار ہے۔ ہم صبح بس سے چلیں گے اور دوپہر تک واپس آجائیں گے۔ میری بیوی بھی کئی دنوں سے کھیر بھوانی جانے کو کہہ رہی ہے۔ اس کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔"

"تو کس وقت چلو گے؟"

"میرا بیٹا آپ کو گیسٹ ہاؤس میں اطلاع دے آئے گا۔ غالباً آٹھ بجے۔"

"تم بھی چلو زمان آزردہ۔"

"مجھے کل ضروری کام ہے۔ شام کو ملوں گا۔"

ہم دونوں برج پریمی کو شب بخیر کہہ کر واپس ہوئے۔ زمان آزردہ مجھے گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر اپنے گھر رعنا واری چلا گیا۔

اگلی صبح میں اور برج پریمی اور اس کی بیوی پیاری رانی بس سے کھیر بھوانی روانہ ہو گئے۔

کوئی نصف صدی پہلے جب میں سری نگر میں پرتاپ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو اپنے والد کے ساتھ کھیر بھوانی گیا تھا۔ میرے والد اُن دنوں جموں و کشمیر کے ٹورزم ڈیپارٹمنٹ میں

تھے۔ اس لیے انھیں ان جگہوں پر جانے کے لیے سرکار سے بڑی سہولتیں میسر تھیں۔ بہت دھندلا سا تصور رہا تھا کھیر بھوانی کا میرے ذہن میں۔ جب میں کشمیر پر ایک بھرپور ناول لکھنے کا پروجیکٹ بنا رہا تھا تو کھیر بھوانی کے دھندلے تصور کو پوری طرح سے نکھارنا ضروری تھا۔

بس کے سفر کے دوران بیچ بیچ میں پریمی نے مجھے کھیر بھوانی کا تاریخی پس منظر بتایا۔

ایک دیومالائی کتھا کے مطابق لنکا کے راجہ راون کے پتا پلستی رشی کشمیر کا رہنے والا تھا جس کو اس زمانے میں ستی سر کہتے تھے۔ جب ایودھیا کے راجہ شری رام چندر نے لنکا پر حملہ کیا اور سگریو اور ہنومان نے راون کے بھائی کنبھ کرن اور اس کے بیٹے میگھ ناتھ کو جنگ میں مار ڈالا، تو راون کی پتنی مندودھری نے اس سے بار بار کہا کہ وہ شری رام چندر سے صلح کرلے۔ راون نے اس کی بات ٹھکرادی۔ راون دیوی پاروتی کا اپاسک تھا۔ اور بڑی لگن سے اس کی آرادھنا کرتا تھا لیکن جب سے وہ سیتاجی کو زبردستی لنکا لے آیا تھا اور انھیں طرح طرح سے پریشان کررہا تھا۔ دیوی پاروتی اس سے بے حد ناراض ہوگئی تھی۔ اور اسے شراپ دیا تھا۔ دیوی پاروتی نے ہنومان سے کہا کہ وہ اسے اس کے رتھ پر اپنے تین سو ساٹھ ناگوں کے ساتھ ستی سر لے جائے۔ ہنومان نے دیوی کی آگیا کا پالن کیا اور اس نے ستی سر کی وادی کے شمال میں تلاملا گاؤں کو دیوی کے نواس کے لیے چنا۔ یہ جگہ اس گاؤں کے درمیان میں واقع تھی اور دریائے سندھ کے ادھر سے گزرنے کی وجہ سے سارا علاقہ دلدل سے بھرا تھا۔ تلاملا گاؤں کے باہر ایک پوتر چشمہ تھا۔ اس جگہ کو ہنومان نے دیوی پاروتی کے نواس کے لیے منتخب کیا اور یہاں دیوی پاروتی درگا کے روپ میں پرکٹ ہوگئی۔ ایک لوک کتھا کے مطابق وہاں کے ایک برہمن کرشن پنڈت کو خواب میں دیوی درگا نے درشن دیئے اور کہا کہ وہ دریائے سندھ میں شادی پور کے مقام سے کشتی میں بیٹھ کر تلاملا کے دلدل بھرے ستھان پر پہنچے اور وہاں اسے ایک سانپ راستہ دکھاتے ہوئے اس پوتر چشمے تک لے جائے گا جہاں اس کا نواس تھا۔ اور چشمے پر پہنچ کر وہ اس میں کود جائے گا۔ کرشن پنڈت نے ایسا ہی کیا اور اگلے دن وہ اس چشمے پر پہنچ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ

اُس سمے اس چشمے کے آس پاس تین سو ساٹھ چشمے تھے جو دھیرے دھیرے مٹی سے بھر کر بند ہوتے گئے۔ ایک سنسکرت شلوک کے مطابق جس روز اس چشمے کو دریافت کیا گیا وہ اشاڑھ سپتی تھی یعنی شکل پکش کا ساتواں دن۔ یاتری ہر اشٹمی کو پوجا کے لیے آتے ہیں اور دیوی درگا کو دودھ، گھی، ناریل اور کھجور کے ساتھ کھیر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے دیوی کو کھیر بھوانی دیوی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس طرح کا چشمہ اور کہیں بھی نہیں جس کے پانی کا رنگ سمے سمے پر خود ہی بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ رنگ گلابی، کبھی ہلکا سفید، کبھی ہلکا پیلا اور کبھی دودھیا ہو جاتا ہے۔ پانی کے رنگ کی اس تبدیلی کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ لیکن جب وادی پر کوئی آفت کا وقت آنے والا ہوتا ہے تو چشمے کے پانی کا رنگ کالا ہو جاتا ہے۔

"کبھی چشمے کا رنگ کالا ہوا بھی ہے پریمی جی؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں! جب سن سنتالیس میں قبائلیوں نے وادی پر اچانک حملہ کیا تھا تو لوگوں کا کہنا ہے کہ چشمے کے پانی کا رنگ ایک دم کالا ہو گیا تھا۔"

پھر برج پریمی خاموش ہو گیا اور میں بس سے باہر ہرے بھرے کھیتوں اور سفیدے اور چنار کے درختوں کو دیکھنے لگا۔ برج پریمی کی بیوی اپنی جھولی میں پوجا کی سامگری سے بھری ٹوکری کو سنبھالے کچھ دیر کو اونگھ گئی تھی۔

بعد میں برج پریمی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سوامی ویویکانند نے بھی کھیر بھوانی دیوی کے پوتر چشمے کا ذکر TALKS WITH SWAMI VIVEKANANDA ——— میں بڑی عقیدت سے کیا ہے۔

برج پریمی حالانکہ اردو کا آدمی تھا اور کشمیر یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ میں تھا لیکن تاریخ پر اس کی نظر بہت گہری تھی۔ کشمیر کی تاریخ کا تو اس نے بڑا وسیع مطالعہ کر رکھا تھا۔ پریمی سے مجھے بہت سی کتابوں کے حوالے ملے۔ در اصل راج ترنگنی کا مطالعہ بھی میں نے انہی دنوں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں کیا۔ راج ترنگنی بھی پریمی ہی میرے لیے یونیورسٹی لائبریری سے ایشو کروا کر لایا تھا۔

جب بس کھیر بھوانی کے باہر پہنچی تو برج پریمی کی بیوی بھی جاگ گئی اور اپنی پوجا والی سامگری کو سنبھالنے لگی۔ ٹوکری پریمی نے سنبھال لی اور بس سے اترنے میں اس کی مدد بھی کی حالانکہ بے چارے کو بس سے اترنے میں خود بھی دقت ہو رہی تھی۔ باہر درجنوں دکانیں تھیں جہاں سے یاتری پھول، ناریل، دودھ وغیرہ خرید سکتے تھے اور انہیں دیوی کی پوجا کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔

مندر کے احاطے سے باہر بائیں طرف میر بابا حیدرؒ کا مزار ہے جو کوئی دو سو سال پرانا ہے۔ کھیر بھوانی دیوی کے درشن کو آئے ہوئے یاتری میر بابا حیدر کے مزار پر بھی سجدہ گزارتے ہیں برج پریمی اور میں نے مزار پر پھول چڑھائے اور سجدہ گزارا۔ اور پھر ہم تینوں مندر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

برج پریمی نے اپنی بیوی کو تو مندر کے سامنے بنے پکے چبوترے پر بٹھا دیا تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر لے اور مجھے اس نے مندر کے احاطے میں گھمایا اور وہ بڑا سا بورڈ بھی دکھایا جس پر کھیر بھوانی کا پرانا اتہاس لکھا ہے اور اس کے لنکا سے تلاملا میں آنے کی بات لکھی ہے۔ پھر برج پریمی اور اس کی بیوی نے بڑی شردھا سے پوجا ارچنا کی اور مجھے بھی پوجا کے سارے عمل میں شریک رکھا۔ پوجا کے بعد وہ مجھے چبوترے سے مندر کو جوڑنے والے لکڑی کے تختے سے گزار کر چھوٹے سے مندر کے اندر لے گیا جہاں کھیر بھوانی دودھ اور شہد اور پھولوں سے بھرے دودھیا رنگ کے چشمے میں ایک اونچی جگہ پر براجمان تھی۔ میں نے عقیدت سے سر جھکا دیا اور من ہی من میں کہا کہ جب میرا کشمیر پر لکھا جانے والا ناول مکمل ہو جائے گا تو میں دوبارہ مندر میں حاضری بھروں گا۔ نہ ہی ابھی تک ناول کی تکمیل ہوئی ہے اور نہ ہی مجھے اب یہ ممکن نظر آتا ہے کہ اپنی وادی میں جا کر کھیر بھوانی کے درشن کر سکوں گا۔ کیا ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

کھیر بھوانی سے لوٹنے کے بعد زمان آزردہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ میرے لئے سبز چائے کا ایک پیکٹ لایا تھا تاکہ میں چنڈی گڑھ واپس جا کر گھر میں کشمیری چائے بناؤں اور اس کے

ذائقے اور حلاوت کا لطف اٹھاؤں۔ رات کا کھانا برج پریمی کے گھر تھا۔

کشمیری کھانا تھا۔ ہاک کا ساگ بہت دنوں کے بعد کھانے کو ملا۔ بہت دنوں کی حسرت پوری ہوگئی۔ برج پریمی کے بڑے لڑکے سبھاش، چھوٹے لڑکے اویناش اور بیٹی کویتا سے ملاقات ہوئی۔ تینوں بچے بڑے خوبصورت اور ذہین تھے۔ سبھاش تو اب خود بھی پریمی رومانی کے نام سے لکھتا ہے اور برج پریمی کی تربیت اُجاگر ہے اس کی شخصیت میں۔ اویناش بھی اب لداخ میں ڈسٹرکٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں کام کر رہا ہے اور کویتا کی شادی ہو چکی ہے۔ یگدیپ جو سب سے چھوٹا بیٹا تھا، شاید وہ بھی اب برسر روزگار ہے۔ سبھاش نے اپنا ٹیپ ریکارڈر سیٹ کر دیا اور برج پریمی نے میرا ایک لمبا چوڑا انٹرویو لے لیا۔ اس انٹرویو کو اس نے بعد میں کیسے استعمال کیا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ انٹرویو میں پریمی نے کشمیر سے میرے تعلق کو زیادہ سے زیادہ اُبھارنے کی کوشش کی اور اس بات کو اُجاگر کرنے کا جتن کیا کہ میری تخلیقات پر کشمیر کی وادی کس حد تک اثر انگیز تھی۔

انٹرویو کے بعد برج پریمی نے اپنی ایک دیرینہ آرزو کا اظہار کیا۔

"ڈاکٹر صاحب میری اب یہ آرزو ہے کہ نٹی پورہ میں اپنا ایک خوبصورت مکان بنا لوں اور یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑنے کے بعد اس میں سکون سے رہوں اور لکھنے پڑھنے کا کام کروں۔"

"نٹی پورہ کی صحیح لوکیشن کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بڈگام والی سڑک پہ ہے اور لال چوک سے صرف چھ کلومیٹر دور ہے۔"

"علاقہ تو بہت خوبصورت ہے۔ مکان بنا ڈالو۔ اگلی بار میں تمہارے اسی مکان میں ٹھہروں گا۔"

میری بات سن کر برج پریمی کے گالوں پہ سرخی اُبھر آئی جیسے یہ شفق کا رنگ تھا جو اس کی آرزو کے آسمان پر کھل اُٹھا تھا۔ وہ ایک دم خوش ہوگیا۔ اور جب رات کے کوئی گیارہ بجے مجھے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس تک چھوڑنے آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ لگتا تھا اس کے پاؤں کا بھاری پن بھی ختم ہوگیا تھا۔

اگلے دن ہم بہت جلدی نکل پڑے۔

برج پریمی کا پروگرام یہ تھا کہ میں اونتی پورہ، بیج بہاڑہ، مارتنڈ، مٹن، عیش مقام اور پہلگام تک گھوم کر آؤں۔ بڑا بیک ٹھیک پروگرام بنایا تھا اس نے۔

"تم بہت تھک جاؤ گے پریمی۔"

"بس ایک دن اور تھکوں گا۔ آپ چلے جائیں گے تو میں ڈیپارٹمنٹ سے چھٹی لے کر کچھ دن آرام کروں گا اور اپنی تھکن اتاروں گا۔"

برج پریمی نے مجھے اور کچھ کہنے ہی نہ دیا۔

مٹن اور مارتنڈ میں اس لیے جانا چاہتا تھا کہ میرے ناول کا ہیرو ان دونوں جگہوں سے بہت گہری طرح وابستہ ہے۔ میں ذرا اپنے ذہن کو کھنگالنا چاہتا تھا۔ یادیں کچھ کچھ دھندلا گئی تھیں۔ البتہ بیج بہاڑہ کے متعلق میری واقفیت بڑی تشنہ تھی لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک مندر میں تو بہت بڑی کرامات ہے۔

قصبے سے باہر بائیں ہاتھ ایک پراچین مندر تھا جس کے ساتھ ساتھ دریائے جہلم بہہ رہا تھا۔ مندر کے احاطے میں ایک شرنی بیضوی شکل کا پتھر پڑا تھا۔ اس پتھر کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اگر گیارہ آدمی اس کے ساتھ ایک ایک انگلی لگائیں اور پھر کاہ کاہ کہہ کر پکاریں تو پتھر اپنی جگہ سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ میرے لئے واقعی یہ اچنبھے کی بات تھی۔ لیکن برج پریمی نے ادھر ادھر سے گیارہ آدمی بٹور لئے اور جب سب نے ایک ایک انگلی پتھر کے ساتھ لگا کر ایک ساتھ کاہ کاہ کہا تو پتھر اپنی جگہ سے اوپر اٹھ گیا۔ میں واقعی حیرت زدہ ہو گیا۔

شام کو جب میں طے شدہ پروگرام کے مطابق سب جگہوں پر گھوم کر واپس آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کشمیر کی تاریخ کے مختلف ادوار کے باب اپنے ذہن میں اس خوبصورتی سے سمو لئے تھے کہ تاریخ کا ہر کردار زندہ ہو گیا تھا۔ مجھے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں چھوڑنے کے بعد اور چائے پیتے ہوئے برج پریمی نے کہا۔

"آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں واقعی بہت تھک گیا ہوں۔"

"ہم آج کے سفر کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے انہیں دو دنوں میں پورا کر سکتے تھے۔"

"تجربے اور احساس میں بس یہی فرق ہے۔"

"تو آپ مجھے احساس سے عاری سمجھتے ہیں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو کل کا پروگرام کم سے کم ٹھیک رکھو۔" وہ میری بات بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔

"میرا ایک مشورہ ہے۔"

"بتائیے۔"

"کل آپ ڈیپارٹمنٹ میں حامدی کاشمیری اور شکیل الرحمن صاحب سے مل لیں۔"

"بہت ٹھیک مشورہ ہے۔"

"اس کے بعد گلمرگ چلیں گے۔"

"او۔ کے۔"

پھر برج پریمی اکیلا ہی اپنے بھاری قدموں سے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ میں اُسے گیسٹ ہاؤس کے باہر کھڑا کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اس وقت میری اپنی ہمت بھی ٹوٹ رہی تھی۔

اگلے دن صبح سویرے میرا پرانا دوست اور مداح صدیقی آ گیا۔ کشمیر یونیورسٹی کا رجسٹرار رئیس احمد صاحب نے میرے ٹھہرنے اور اِدھر اُدھر گھمانے کا انتظام اسی کے ذمے لگا رکھا تھا۔ صدیقی بہت دیر نہیں رکا۔ یونیورسٹی میں کسی پوسٹ کے لیے انٹرویوز تھے اور اُسے دفتر پہنچنا تھا۔

"رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گے۔"

"ضرور کھاؤں گا۔"

"آج آپ گلمرگ جا رہے ہیں نا؟"

"جی واپس آتے ہی ٹیلی فون کیجئے۔ میں آ کر لے جاؤں گا۔"

"بہت اچھا۔"

"اب جانے دیجئے۔ رئیس صاحب کو تو میں نے بتا دیا ہے۔ آپ کے پروگرام کے بارے میں۔"

"رئیس صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بہت ہی اچھے۔" صدیقی نے جواب دیا۔

میں نے غسل کیا اور پھر ناشتے کے لیے کہہ دیا۔

ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ برج پریمی اور زمان آزردہ آ گئے۔

"کل تو بہت گھومے آپ۔"

"ہاں۔ بے چارے پریمی کی حالت خراب ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"لگتا ہے آپ اس کا دوسرا پاؤں بھی بھاری کر کے جائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے پہلا پاؤں بھی ہلکا ہو جائے۔"

میری اس بات پر زمان آزردہ بہت زور سے ہنسا۔ زمان آزردہ ہنستا بہت کھل کر ہے۔ مجھے کنجوسی سے ہنسنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ زندگی میں کنجوسی کرو ہی کیوں ہنسو تو کھل کر ہنسو اور روؤ تو کھل کر روؤ۔ جینا فراخ دلی سے چاہیئے۔ فراخ دل لوگوں کے ساتھ زندگی بھی بڑی فراخ دلی سے پیش آتی ہے۔ حالانکہ ذاتی طور پر وہ بے حد سود خور ہے اور کبھی کبھی اتنا سود وصول کرتی ہے کہ جی چاہتا ہے تم اصلی رقم بھی لوٹا دو اور سرخرو ہو جاؤ۔

یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں سبھی لوگ ملے۔ سب نے بڑی محبت اور عزت کا اظہار کیا۔ حامدی کاشمیری بہت خوش تھا۔ وہ جتنا اچھا شاعر اور نقاد ہے اتنا ہی اچھا انسان بھی ہے۔ اب اس نے اپنا مکان شالیمار کے قریب بنا لیا ہے اس لئے وہاں جانا مشکل تھا۔ اس لئے ڈیپارٹمنٹ میں ہی اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا تھا۔ شکیل الرحمن کی رہائش تو یونیورسٹی کیمپس میں ہی تھی۔ اس لئے اس نے شام کی چائے کی دعوت دی اور برج پریمی سے کہا کہ وہ مجھے ساڑھے پانچ بجے تک واپس لے آئے۔ پریمی نے حامی بھر لی جب

ہم یونیورسٹی کیمپس سے باہر نکلے تو گیارہ بج چکے تھے۔

راستے میں کچھ وقت ہم نے پٹن کے پرانے مندروں میں گزارا کشمیر کی تاریخ میں پٹن کے پُرانے مندروں کی بھی ایک خاص اہمیت ہے۔ ایک بات جو بار بار میرے ذہن میں اُبھرتی رہی وہ یہ تھی کہ تاریخیں کبھی ایک طے شدہ پیٹرن پر نہیں بنتیں۔ اگر ایک دور کمال کا ہے تو دوسرا دور زوال کا۔

اور تیسرا دور ایسا ہوگا جو ایک دم سپاٹ ہوگا۔ اس میں نہ کوئی قابل قدر شخصیت اُبھرتی ہے اور نہ کوئی ایسا سانحہ ہی ہوتا ہے جس سے تاریخ کو ایک نیا موڑ ملے کشمیر کی تاریخ نے جتنے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں وہ میرے اس نظریئے کے گواہ ہیں۔ اب شاید کشمیر کی ایک نئی تاریخ لکھی جانے کے لئے مواد تیار ہو رہا ہے۔ جانے وہ کونسا مورّخ ہوگا جو کشمیر کی نئی تاریخ مرتب کرے گا۔ اور کب یہ تاریخ مرتب ہوگی، یہ بھی تو کوئی نہیں جانتا۔ بڑی کوشش کے باوجود ہم یونیورسٹی کیمپس سے ساڑھے سات بجے سے پہلے واپس نہ آسکے۔ ہم بجائے گیسٹ ہاؤس جانے کے سیدھے شکیل الرحمٰن کے مکان پر پہنچے کہ وقت پر حاضر نہ ہوسکنے کے لیے معافی مانگوں۔ شکیل الرحمٰن اپنے مکان کے سامنے سڑک پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ میں نے وقت سے نہ پہنچنے کے لیے معذرت پیش کی اور تاخیر کی تمام تر ذمہ داری اپنے اوپر لے لی لیکن شکیل صاحب مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ بے حد ناراض تھے۔ میں نے اُن کی بات کاٹنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ غصے میں آگئے۔

مجھے یہ بات ناگوار گزری۔ برج پریمی تو اخلاق کا مارا ہوا آدمی تھا۔ وہ تو ایک دم خاموش رہا۔ بے چارہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

میں نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن شکیل صاحب کا موڈ اس قدر برہم تھا کہ وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔

ہم دونوں چلے آئے۔ لیکن برج پریمی کی ذہنی حالت بے حد خراب تھی۔ میں نے رات کو شکیل الرحمٰن صاحب کو ایک سخت قسم کا خط لکھا اور اگلی صبح وہ خط اُن تک

پہنچانے سے پہلے برج پریمی کو بھی پڑھا دیا۔

پریمی اتنا حساس آدمی تھا کہ وہ خط سن کر آب دیدہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ اس سے زیادہ شکیل صاحب کو اور کچھ نہیں لکھا جا سکتا تھا۔

اگلی صبح میں نے خط شکیل صاحب کے گھر بھجوا دیا۔ اس خط کا اُن پر کیا ردِ عمل ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں۔

نو بجے کے قریب میرے ٹیلی فون کرنے پر صدیقی آگیا اور مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے رات کا کھانا بھی کھلایا اور تحفے بھی دیئے۔ دوستوں کی کرم فرمائیاں اور محبتیں ہی انسانی زندگی کا حاصل ہیں۔

ورنہ اور ہے کیا ہمارے پاس جسے ہم قیمتی امانت سمجھ کر زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رکھیں

اب صرف ایک دن میرے پاس تھا۔

وہ دن میں نے لال منڈی میں یوسف ٹینگ اور محمد احمد اندرابی سے ملاقات میں گزارا۔ پرتاپ سنگھ ہائی اسکول کی عمارت میں کچھ دیر گزارنے کے لیے وہاں گیا۔ برج پریمی یہاں بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ وہ اسکول تھا جہاں میں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ دیر کے لیے امیرا کدل گیا اور ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ میں اپنا پرانا مکان دیکھا اور شیر گڑھی کے پرانے محلات دیکھے۔ پھر میں ٹنہ مالو کے میدان کو بھی دیکھنے گیا اور نصف صدی پہلے کا وہ نظارہ میری نظروں میں گھوم گیا جب وادی کے عوام نے مہاراجہ کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور لوگوں کو اسی میدان میں ٹکٹکی پر چڑھا کر کوڑے لگائے جاتے تھے۔ برج پریمی کو اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے یہ دردناک نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ میں تو درج ہے لیکن اس کے گواہوں میں ایک میں بھی تھا کسی کو معلوم نہیں۔ شام کو کچھ دیر رئیس احمد صاحب کے ساتھ گزاری جن کی محبت ہی مجھے اس بار کشمیر لے گئی تھی۔ اس کے بعد میں گیسٹ ہاؤس میں آگیا۔ جو چھوٹی موٹی چیزیں میں نے زبان آذر دہ کے ذمے لگائی تھیں، وہ سب اس نے خرید لی تھیں اور اپنے ساتھ

لے آیا تھا۔

"آپ نے جو کتابیں اور میٹریل میرے ذمے لگایا ہے وہ میں کچھ دنوں میں بھجوا دوں گا۔"

برج پریمی نے کہا۔

"برج پریمی کی ایک فرمائش ہے۔" زمان آزردہ بولا۔

"کیا فرمائش ہے یار تمہاری جس کا اظہار تم نے مجھ سے تین دنوں میں نہیں کیا؟"

"زمان آزردہ ہی بتائے گا۔"

"جب تم نے پہلی بار کسی لڑکی سے پیار کیا تھا تو اس کا اظہار تم نے خود کیا تھا یا کسی دوسرے سے کرایا تھا؟" میں نے سوال کیا۔ اس پر زمان آزردہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

"اس کے اظہار کرنے سے پہلے ہی کوئی دوسرا لڑکا اس لڑکی کو اڑا لے گیا تھا۔"

"اردو کے شاعروں کے ساتھ اکثر یہی ہوتا ہے۔" میں نے بھی قہقہے میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کی فرمائش تو بتاؤ۔" میں نے زمان آزردہ کو مخاطب کیا۔

"یہ چاہتا ہے کہ آپ کشمیر کے موضوع پر لکھی ہوئی تمام کہانیاں اسے دے دیں اور وہ انہیں کتاب کی شکل میں چھاپ دے۔"

"بس اتنی سی فرمائش ہے تمہاری؟"

میرے اس سوال پر برج پریمی کے گورے گال ایک بار پھر سرخ ہو گئے۔

"جی ہاں یہی فرمائش ہے۔"

"میں جلدی گڑگاؤں واپس پہنچتے ہی کشمیر سے متعلق سب کہانیوں کے تراشے تمہیں بھجوا دوں گا۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی کتابیں خود ہی چھاپتا ہوں۔ ان پر اپنا ہی روپیہ لگاتا ہوں۔"

"کتابیں بکتی بھی ہیں کچھ؟"

"بکنے کا عمل بڑا طویل اور صبر آزما ہے ذاکر صاحب۔"

"تو اس کا مطلب؟"

"میں کچھ دے نہیں پاؤں گا۔"

"چار پانچ کتابیں میرے ذاتی ریکارڈ کے لیے تو بھیج دو گے؟"

زمان آزردہ نے تو حسب معمول قہقہہ لگایا لیکن قہقہے کی روشنی برج پریمی کی آنسو بھری آنکھوں میں عکس ریز ہونے لگی۔

میں نے برج پریمی کو اپنی باہوں میں لے لیا اور کہا۔

"برج پریمی تمہارے دل میں بے پناہ درد ہے۔ میں اس کا احترام کرتا ہوں۔"

اس نے لرزتی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

آج جب میں پریمی رومانی کے اصرار پر اس کے والد برج پریمی کے بارے میں یہ چند صفحات لکھ رہا ہوں تو مجھے بڑی ندامت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں جب کشمیر سے لوٹ کر چنڈی گڑھ آیا تو بے کار قسم کی مصروفیات میں الجھ گیا۔ اور برج پریمی کو وعدے کے مطابق کہانیاں نہ بھیج سکا۔ پھر اس کا ایک خط بھی آیا جس میں اس نے کہانیاں بھیجنے کے وعدے کی یاد دلائی تھی اور کشمیر کی تاریخ سے متعلق کچھ میٹریل بھی بھیجا تھا۔ میں نے اس کے خط کے جواب میں اسے دوبارہ یقین دلایا کہ میں جلد ہی اسے کہانیاں بھجوا دوں گا۔

احساسات اور جذبات کا مارا ہوا برج پریمی میرے وعدوں پر یقین کرتا رہا لیکن میں اتنا بدقسمت ہوں کہ اپنا وعدہ نہ نبھا سکا اور زندگی کے فضول کاموں میں الجھ کر وقت ضائع کرتا رہا۔

برج پریمی آخر کب تک میرے وعدے کی تکمیل کا انتظار کرتا۔

وہ مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کشمیر تو کیا، دنیا ہی چھوڑ گیا۔

اس کی وہ آرزو بھی تشنہ تکمیل ہی رہی کہ وہ نٹی پورہ میں ایک خوبصورت مکان بنائے گا اور اس میں اطمینان اور سکون سے تخلیقی کام کرے گا۔

برج پریمی! تم بہت سچے اور کھرے آدمی تھے۔ تم اس دُنیا کے قابل نہیں تھے جس میں میرے جیسے جھُوٹے دوست رہتے ہیں؛ جو صرف وعدے کرتے ہیں اور جنہیں وعدوں کی عظمت کا احساس نہیں۔

میں اپنے بھرپور جھُوٹے پن سے تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

موتی لال ساقی

میرا رفیق میرا ہمدم

ڈاکٹر برج پریمی کو سورگ سدھارے اب ایک سال ہوگیا۔ وہ خانہ بدوشی کی حالت میں دنیا چھوڑ کر چلا گیا۔ اور میں اپنی لاش کندھے پر اٹھائے گزشتہ پندرہ ماہ سے روتا پھرتا ہوں پینتیس ۳۵ سال کی دوستی میں اس نے مجھے کبھی بھی جل نہیں دیا مگر آخری بار وہ مجھے جل دے کر چلا گیا۔ ایک ایسے سفر پر جو ہمارا بھی مقدر ہے۔ اگر بن پڑتا تو میں ضرور اس کا ساتھ دیتا تاکہ راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے ہم طویل سفر کو بھی طے کر لیتے۔ کیونکہ ہم راتوں بیٹھ کر باتیں کرنے اور سگریٹوں کا دھواں اڑا کر کبھی بھی نہیں تھکتے۔ ایک بار نہیں سینکڑوں بار ایسا ہوا کہ ہم نے باتیں کرتے کرتے راتیں بتا دیں۔ ادب کی باتیں، سیاست کی باتیں۔ گھر گرہست اور دنیا داری کی باتیں۔ دوستوں کی جعلسازیوں اور دشمنوں کی مروت کی باتیں اور اگر کچھ دیر کے لئے آپس میں مل نہیں پاتے تو طویل خطوط لکھ کر ایک دوسرے کا حال جاننے کی کوششیں کرتے۔ برج پریمی میرے لئے صرف دوست نہیں تھا بلکہ شفیق بھائی اور ہمراز تھا۔ میری زندگی میں وہ موسم بہار کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور دم واپسی تک میرے گرد و پیش کو مہکاتا رہا۔ پریمی کی موت میرے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کی جدائی سے میرے اندر کا خلا کتنا وسیع ہوگیا ہے۔ اس کا اظہار میرے بس کی بات نہیں۔ ہاں اس کا اندازہ آپ کو پریمی کے ایک خط کے اقتباس سے ضرور ہو سکتا ہے:

"ساقی! کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ ہمارا جنم جنم کا ساتھ رہا ہے۔ ہم نے بہت سارے جنموں میں اکٹھے مل کر محبت کی ہے نفرت کی ہے۔ پیار، محبت اور جھگڑے کئے ہیں۔ یہ یادیں، آرزوئیں، نامکمل جذبے، دھڑکنیں اور پیار کے اُبلتے سوتے۔ یہ یک لخت کس طرح بیدار ہو گئے ہیں۔ ہماری کوئی بچپن کی جان پہچان نہیں رہی ہے۔ ہم نے کبھی اکٹھے بیٹھ کر زندگی کے پگ پر قدم نہیں دھرے ہیں۔ ہماری واقفیت محض ایک ڈراما کی کیفیت رہی ہے لیکن یہ ڈراما زندگی کا زور محبت کا سرشار چشمہ بن گیا ہے۔ میں آج کل آہستہ آہستہ ماضی پرست ہوا جاتا ہوں۔ پرانی ہندو سنسکرتی، فلاسفی تاریخ اور دوسری باتوں کا قائل ہوا جاتا ہوں۔ پریم چند کی کہانیوں شرت کے ادب، تاریخ کے مطالعہ اور رشاردا جیسی تصویروں نے مجھ میں عجیب تبدیلی پیدا کر دی ہے اور میں اُن باتوں کا قائل ہوا جاتا ہوں (مذہبیات کے بغیر) کہ ہم ماضی میں عظیم رہے ہیں۔ اُس عظمت میں کتنی پوترتا، کتنا پیار، کتنے صادق جذبے، کتنا تحمل، کتنا ایثار اور ضبط تھا۔ کاش ہم آج بھی اتنے ہی عظیم ہوتے۔

اُس عظمت کے نشان اُس پوترتا کے جذبے کو میں تمہاری اور اپنی محبت میں پاتا ہوں۔ جانے یہ سچے بھی ہیں یا نہیں مگر مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ میں اکثر راتوں کو جاگ پڑتا ہوں تو ذہن فوراً دھانورہ پہنچ جاتا ہے۔ آنکھیں تم کو تلاش کرتی ہیں۔ تم ملتے ہو، باتیں ہوتی ہیں اور میں پھر سو جاتا ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ تم کو ایک طویل عرصے تک نہ پا کر میں پریشان سا ہو جاتا ہوں۔ یہ سب میرے لئے ایک معمہ ہے۔ تم ہی اسے حل کر دو۔"

خط - ۱۶ جنوری ۱۹۵۶ء (پانچ بجے صبح)

ایک من بھانے اور شفیق دوست سے محرومی کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا آپ سب لوگوں کے لئے کچھ نہیں۔ درصل ہم دونوں کے درمیان بہت سے معاملات میں گہری مماثلت تھی۔ زندگی نے مجھے ہر موڑ پر کڑے امتحان سے دوچار کیا اور یہی کچھ پریمی کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ کافی دیر

تک چین کی نیند سے بھی محروم رہا۔ گھریلو پریشانیوں، نامساعد مالی حالات، عزیز و اقربا کی بے التفاتی ان سب شعبوں میں ہم دونوں نے ایک جیسے پاپڑ بیلے ہیں۔ اپنے ایک خط میں اپنے ماضی کو ٹٹولتے ہوئے لکھا ہے۔

"تم نے اپنی زندگی کی ہار کے بارے میں بڑے دُکھ اور افسوس کے ساتھ لکھا ہے۔ تم نہیں جانتے ساقی! میرا ماضی بہت دردناک رہا ہے۔ کانٹے ہمیشہ میرے دامن میں پھنسے رہے ہیں۔ میں نے کبھی بھی پھولوں کا دیدار نہیں کیا۔ وہ دُور سے ہی صرف اپنا رنگ حسن اور بو دکھا دکھا کر مجھے للچاتے رہے ہیں اور میں تڑپتا رہا ہوں اور کانٹوں کی یہ سجی سجائی سیج مجھے ہمیشہ چبھتی رہی ہے۔ اور آج بھی جب میں زندگی کی اس لمبی پگڈنڈی پر چلتے چلتے ذرا رک سا جاتا ہوں اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں نے یہ پُرخطر منزلیں کیسے طے کی ہیں۔ اُن مشکل پڑاؤں کے نشان اب بھی میرے سارے وجود میں موجود ہیں۔ اور اُن کو ٹٹولنے میں گہری سوچوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ وراثت میں ملا ہوا یہ اثاثہ میری بنیادوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔"

ایک خط ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء

گھریلو پریشانیوں اور مالی مشکلات کی وجہ سے اُسے کافی محنت کرنا پڑتی تھی جس کے نتیجے میں چھٹی دہائی میں ہی اُس کی صحت پر مضر اثرات پڑنا شروع ہوئے تھے۔ وہ اکثر ٹانگوں کی تکلیف کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کافی دنوں تک اُس کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں پریشان سا ہو گیا کہ بات کیا ہے کہ اچانک ایک خط آ پہنچا۔

"کل سے میں نے سکول آنا شروع کیا ہے۔ تقریباً دس دن سکول سے غیر حاضر رہا۔ کافی بیمار تھا۔ موت کے منہ سے واپس لوٹ آیا ہوں۔ KIDNEY TROUBLE نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ بڑا خطرہ پیدا ہوا تھا۔ دن رات لیٹے لیٹے رہنا پڑتا تھا۔ اب حالات سدھر گئے ہیں گو صحت کافی گر گئی ہے۔ کمزوری اور نقاہت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سکول پھر بھی بس اور تانگے سے آیا جایا کرتا ہوں۔ سارا جسم ورم زدہ تھا۔ کافی فاقہ"

۲۳ مئی ۱۹۵۸ء

پریمی کی طرح میں بھی کافی دیر تک مالی مشکلات کا شکار رہا۔ مگر جب مصیبت حد سے گذرتی ہے تو انسان کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ اُس وقت میرے ساتھ ہوا جب اُس نے لکھا۔

"مالی پریشانیاں کافی بڑھ گئی ہیں۔ فارم اور فیس بھرنے کی آخری تاریخ بھی جا رہی ہے۔ دیکھتا ہوں کیا ہوگا۔ جواہر کا ایک خط آ گیا تھا لیکن اُس نے پیسوں کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ میں خود مانگ بھی نہیں سکتا۔ حالات بڑے عجیب ہیں۔ سکول کا کوئی چالیس ۴۰ روپے قرضہ ہے۔ فیس کے لئے ساٹھ ۶۰ روپے ایک آدمی سے مانگ لئے ہیں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کتابوں کے لئے پیسے نہیں۔ اپنے اور بچّوں کے لئے گرم کپڑے نہیں۔ یہ مشکلات اور دقّتیں میں ازل سے لے کے آیا ہوں۔ عمر بھر تڑپتا رہوں گا اور یہی حسرت لے کر اس دُنیا سے چل بسوں گا اور میری چتا کے ایک طرف لکھا جائے گا:

"یہاں آرزوؤں اور کلپناؤں کا مزار ہے۔"

ایک خط۔ ۲۹ نومبر ۱۹۵۷ء

ذہنی اضطراب اور ناساعد حالات نے پریمی کو وہ سب کچھ لکھنے سے باز رکھا جو لکھنے کی اُس میں بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔ میں اکثر اُسے یاد دہانی کراتا رہتا تھا کہ اپنے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھو۔ حالانکہ میں اُس کی ذہنی کیفیت سے بخوبی واقف تھا۔ میرے اصرار پر وہ کبھی کبھی بھڑک بھی اُٹھتا تھا اور کہتا "نہیں ہوگا مجھ سے نہیں ہوگا یہ تمہارا لکھنا پڑھنا" اور کسی وقت جواباً تحریر کرتے۔

"تم نے قوتِ تحریر کے بارے میں پوچھا ہے۔ جب ذہن پر زنگ کی موٹی تہیں چڑھ گئی ہوں تو قوتِ تحریر کہاں سے آئے۔ سب کچھ کھو چکا ہوں۔ خط تک بھی لکھا نہیں جاتا۔ بقول قمر جلال آبادی "بانجھ ہو گیا ہوں"۔

ایک خط۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء

پریمی اُردو ادب کو بہت کچھ دے سکتا تھا۔ مضامین، کہانیاں، تنقید، غرض وہ سب کچھ جس سے ادب عبارت ہے مگر وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں کر سکا کیوں۔ جواب اُس کے خطوط میں موجود ہے۔

"در اصل ان دنوں میں سخت پریشان ہوں۔ گھر کا اتا درن کچھ اس قدر اُلجھ گیا تھا کہ میں بہت

زیادہ پریشان رہا۔ بہت دکھی ہوں، ذہنی، روحانی اور جسمانی عذاب جھیلتا ہوں۔ زندہ ہوکے بھی ایک منٹ میں سو سو بار مرتا ہوں۔ چین کا ایک لمحہ بھی نہ ملا۔ آزادی سے سوچنے کے لئے ایک پل بھی نہ ملا۔ ذہن کے کرب کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی دور نہ کر سکا۔

ایسے حالات میں تم کو کیا خاک لکھ پاتا۔ لکھ نہ سکا۔ لکھنے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی پوری نہ ہوئی۔ آج پورے طور سے اس دیوانگی سے باہر نہیں آیا ہوں۔ ذہن مفلوج ہے۔ سوچنے کی صلاحیت زائل ہو چکی ہے۔ پڑھنے لکھنے سے دل بالکل نہیں بہلتا ساتھی اگر کوئی ہے تو وہ سگریٹ کے طویل کش۔ اور بھیانک سوچیں۔"

۲ جنوری ۱۹۵۸ء

مگر جب بھی حالات بہتر ہو جاتے تو پریمی زندگی کی دوڑ میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہو جاتا اور اپنا مقدور بھر حصہ ادا کرتا۔ سیاست سے ادب تک ہر شعبے میں اس کی دلچسپی لوٹ آتی اور تلخیوں کو بھول کر زندگی کی مٹھاس کو محسوس کرنے کی سعی کرتا تھا۔ کبھی کسی رسالے کے ادارتی بورڈ میں شامل ہو جاتا تو کبھی خود رسالہ جاری کرنے کی سوچتا۔ کبھی مختلف ادبی انجمنوں کی رکنیت قبول کرتا تو کبھی سیاست کے خارزار میں سرگرم رہنے سے بھی نہیں چوکتا۔ پریمی آل جموں و کشمیر ٹیچرس فیڈریشن کے سرگرم کارکنوں میں شامل تھے۔ ۱۹۵۷ء میں آئین ساز کونسل کے لئے اساتذہ کے نمائندوں کا انتخاب ہونا قرار پایا۔ کشمیر سے اساتذہ کی طرف سے دینا ناتھ نادم امیدوار تھے جبکہ بخشی عبدالرشید نے مبارک شاہ قادری کو کھڑا کیا تھا۔ مقابلہ کافی سخت رہا حالانکہ سرکار نے نادم صاحب کو ہرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ پریمی صحت کی ناسازی کے باوصف اس مہم میں سرگرم رہے۔ حالانکہ جیت اسی دھڑے کی ہوئی جس دھڑے میں پریمی شامل تھا مگر جو کچھ اس الیکشن کے دوران ہوا، اس کا پریمی کو سخت دکھ تھا۔ لکھتے ہیں،

"ہمارے سامنے ایک بہت ہی اہم مسئلہ الیکشن کا کھڑا ہوا ہے اور ہماری سیاست دھڑہ

بندی میں تقسیم ہے۔ اس کا پرتو زندگی کے ہر شعبے پر پڑ رہا ہے۔ بہت سارے عناصر ذلیل اقدامات پر اُتر آئے ہیں۔ اُن کے چہرے بڑے جاذب نظر ہیں لیکن رُوح کھوکھلی ہے اور حربے بہت ہی اوچھے۔ فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کو خوب اُبھارا جارہا اور صداقت اور سچائی کا گلہ گھونٹا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا کچھ پروگرام ہے۔ وہ وہاں آنے پر تم پر واضح کروں گا۔ ہر قدم پر خطرہ ہے لیکن ہم میدان میں آنکلے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس کا حشر بہت ہی بھیانک ہوگا لیکن......"

۱۱ر جون سال حال

ہماری یہ عادت تھی کہ اپنے پڑھنے لکھنے کے اندازِ فکر میں ایک دوسرے کو شامل کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر میں کسی ادبی تقریب میں شامل نہیں ہو پاتا تو پریمی مجھے اسکی روئیداد لکھ بھیجتے تھے۔ جو کچھ پڑھتے اُس کے بارے میں اپنے تاثرات اور اندازِ فکر سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ خطوط کافی طویل ہیں مگر چند ایک اقتباس پریمی کی تنقیدی صلاحیت اور اُس کے نقطۂ نظر سے آشنائی فراہم کرتے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک گرجا ایک خندق کرشن کا بڑا نثری کارنامہ ہے۔ کالو بھنگی، شہتوت کا درخت، ایک دن دوسری موت، علیا آباد کی سرائے، اس کی بہت حسین کہانیاں ہیں۔ کتاب تمہارے لئے رکھ چھوڑی ہے۔ پریم چند پر رہبر کی کوشش اچھی ہے لیکن اسے زیادہ اچھی نہیں کہا جا سکتا، کتاب تشنہ ہے۔ رام بلاس شرما نے "پریم چند اور اُن کا یگ" بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ گوشۂ عافیت پریم چند کا شاہکار ہے۔ اسے ضرور پڑھ لو۔ پریم چند کی ذہنی افتاد اور فکری اُٹھان کی بہترین عکاسی کتاب کرتی ہے۔ ویرداس بنگالی زندگی کی آئینہ دار ہے اور میں نے کافی آوارہ اور دیوداس کے خالق کی اس تخلیق کو پڑھا ہے۔ اور بنگال کے لئے میرا سر جھک گیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ دردناک ہے اور انسان روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں کتاب پڑھتے پڑھتے دو تین بار رو دیا ہوں۔ ناول میں SUSPENSE اس طرح قائم کرنا شرت کا ہی

کام ہے۔کردار نگاری میں شرت اُستاد ہے۔ بہت ساری جگہوں پر پریم چند سے
زیادہ اچھا تاثر مِلتا ہے۔ حالانکہ دونوں کی لائن LINE الگ الگ ہے۔ مگر ترجمے
کی خامیاں ہیں۔ تم کتاب ضرور پڑھ لو۔"

اور "آوارہ" کے بارے میں اُن کے تاثرات سُنیئے:۔

"تمہارا کارڈ ملا۔ "ادب کے مادی نظریئے" اور "آوارہ" بھیج ما ہوں (ادب کے مادی نظریئے پڑھے
بغیر اور "آوارہ" پڑھ کر) آوارہ ایک عظیم تخلیق ہے، جسے شرت ہی لکھ سکتا ہے۔ بنگال
خوبصورت اور بدصورت بنگال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ بنگال کا کلچر کتنا حسین ہے،
مجھے اس سے والہانہ عشق ہے۔ بنگال کی عورتیں FAITH اور DEVOTION کس قدر
بلند ہے، سر جھک جاتا ہے۔

اُوپندر کا کردار اِس طرح اُبھارا گیا ہے کہ کتاب کا آخری حصہ پڑھ کر محسوس
ہوتا ہے جیسے جگر کٹ رہا ہے۔ کرن مئی کا کردار اُلجھا ہوا ہے۔ وہ محبت کا انتقام اِس
خوفناک طریقے سے لے سکتی ہے۔ بڑا عجیب ہے۔ نفسیاتی ہے لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں
غیر فطری ہے۔ ساوتری کا کردار کتاب کی جان ہے اور ساوتری کو سمجھ کر میں بنگال کو
سمجھ سکا ہوں۔ ستیش مجموعہ اضداد ہے۔"

باتیں بہت ساری ہیں مگر تمام باتوں کو ایک نشست میں زیرِ بحث لانا ممکن نہیں۔ ۲۷ اپریل
۱۹۵۷ء کو ایک افسانوی خط پریمی نے میرے نام لکھا تھا:۔

"آج رات کتنی دردناک ہے! فضا سسکیاں لے رہی تھی۔ اندھیارے لپک لپک
کر چیخ رہے تھے۔ ہواؤں کی ساری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ میں بڑبڑا کر جاگ پڑا۔ میرے
سرہانے رکھی برٹش ہسٹری مُنہ بسورے سو گئی تھی۔ باہر بھیانک اندھیارا تھا۔ اور
رات روتے روتے اونگھ گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ گلی پر لگے ہوئے کھمبے کے
لیمپ سے دھیمے سے وجہ پوچھی۔ ساتھی بجلی کے لیمپ نے ہچکی لی۔ کیا ہوا اُسے؟ میں نے

پریشان ہو کر نیند سے بوجھل پپوٹوں کو ملتے ہوئے پھر پوچھا۔ پلا پلا کر بے دم ہو گیا تھا بے چارا اور پھر ـــــــ" بجلی کے لیمپ کی روشنی بجھنے لگی۔ اور پھر کیا ہوا پھر؟ میرا دِل بیٹھ گیا۔" اسی بے ہوشی میں اس کا کام تمام ہوا" لیمپ نے اندھے ہوئے گلے سے ہزاروں ہچکیوں اور آہوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور میری گلی کے نکڑ پر لگے ہوئے کھمبے پر وہ روتا ہوا لیمپ یک لخت ٹوٹ گیا۔"

"دو ماہ ہوئے جب تم نے پران تیاگ دیئے۔ تم مر گئے اور ساری کائنات موت کی وادیوں میں بھٹک گئی۔ تم ہی کہو یہ حادثہ رُوح فرسا نہیں تو اور کیا ہے؟ کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا کبھی بھی کسی صورت میں کسی آنسو میں۔ کسی خوشبو میں تم نہ ملے اور بہاریں رُوٹھ گئیں تم کو نہ پا کر آہ! مرنے والے کس قدر بے درد ہوتے ہیں۔ کب زندہ ہونے کا ارادہ ہے۔ کم بخت۔ یہ دائمی موت تو نہیں۔ ابھی منن مر دوست۔ کہ دُنیا وسیع اور رنگین ہے۔"

دُنیا کی وسعتوں اور رنگینیوں کا پرستار اور شیدائی پریمی دُنیا چھوڑ کر چلا گیا اور مجھے ماتم داری کے اندھیارے میں دھکیل گیا۔

پُشکر ناتھ

یار زندہ نہیں — صحبت باقی ہے

برج پریمی کے بارے میں کچھ تحریر کرنے سے پہلے میں نے دُعا مانگی ہے کہ یا خدا اس تحریر کے دوران مجھے جذباتیت سے محروم کر دے۔ کیوں کہ میں برج پریمی کے بارے میں لکھتے ہوئے کسی قسم کی جذباتیت سے پاک رہنا چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اس لئے کہ میرا اور برج پریمی کا رشتہ جذباتیت پر اُستوار تھا؟ کیا اس لئے کہ میں نے اور برج پریمی نے اپنے لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ اکھٹے گزارا تھا؟ کیا اس لئے کہ میں نے اور برج پریمی نے اُردو زبان و ادب کے ساتھ عشق ایک ساتھ شروع کیا تھا؟

اب ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کوئی کہاں تک جائے؟ کیا عالی کدل کے اس خستہ حال مکان تک جس کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی اور جس میں بیٹھ کر ہم دونوں اُردو کے افسانے اور نظمیں پڑھ کر نہایت سنجیدہ قسم کی بحثوں میں اُلجھ جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی دست و گریبان ہو جایا کرتے تھے۔ یا اُن کیچڑ سے بھری ہوئی سڑکوں تک جن سے گزر کر ہم دفتروں سے چھٹی کر کے گھر آیا کرتے تھے۔

برج پریمی ایک سکول ماسٹر تھے۔ اور میں ایک سرکاری دفتر میں کلرک نہ جانے وہ کوؤں کے غول کہاں چلے گئے ہیں جو شام ڈھلتے ہی ہماری طرح نہ جانے کن دفتروں یا اسکولوں سے چھٹی کر کے اپنے گھروں کو

لوٹا کرتے تھے۔ گھر لوٹتے ہوئے شور وہ بھی مچاتے تھے اور ہم بھی۔ وہ اپنی نہ جانے کن بحثوں میں اُلجھے ہوتے تھے۔ اور ہم اپنی ادبی بحثوں میں۔ انہی بحثوں میں اُلجھتے اُلجھتے ہم نے لکھنا شروع کیا افسانے میں نے بھی لکھے اور برج پریمی نے بھی۔ اور لکھتے لکھتے بہت دُور نکل گئے۔ میں نے کوئی دفتری امتحان نہیں دیا۔ مگر برج پریمی نے کئی امتحان پاس کیئے۔ اُسے زندگی میں آگے بڑھنے کی کتنی تمنا تھی۔ اور آگے بڑھنے کے لئے اُس کے پاس ایک ہی رستہ تھا تعلیم اور مزید تعلیم۔ کیوں کہ سفارش اور رشوت اور سیاسی سماجی یا اقتصادی پُشت پناہی نہ اُس کے پاس تھی۔ نہ میرے پاس۔ چنانچہ سنگل ٹیچر اسکول کی ماسٹری سے برج پریمی ترقی کرتے کرتے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ریڈر ہو گئے۔ لیکن اس تمام جدو جہد کے دَوران ہمارے درمیان تقریباً تین سو کلو میٹر کا فاصلہ تھا۔ وہ سرینگر میں ڈٹے رہے اور میں جموں چلا آیا۔ کبھی سال چھ مہینے میں مُلاقات ہوتی تھی تو ادبی باتوں کے علاوہ وہ اپنے گاؤٹ کے بارے میں سُناتے۔ ایک دن کہا کہ ذیابیطس کی بیماری میں مُبتلا ہو گئے ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ برج پریمی ایک اچھی عزت دار اور صاف ستھری زندگی پانے کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ اور آخر کار اس موذی مرض نے اُسے قبل از وقت دُنیا کی نظروں سے رُوپوش کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور جنت میں بیٹھا ہو گا۔ کیوں کہ اُس نے زندگی کے دَوزخ کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ اُس کی آنکھوں کی تمام طراوت اور لطافت مجروح ہو گئی تھی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ برج پریمی نے افسانوں سے مُنہ موڑ کر تنقید اور تحقیق کی طرف رجوع کیا تھا۔ ایک بار تین چار برس پہلے میں نے اس بات کی شکایت ایک خط میں کی تھی۔ خط شاید کچھ طنز یہ ہو گیا تھا یا شاید کچھ تلخ بھی۔ کیوں کہ اُس نے کبھی اس خط کا ذکر نہیں کیا اور نہ اس کا جواب دیا۔ مجھے گلہ تھا کہ اپنی پہلی کہانی آقا سے لے کر اس کی موت لمحوں کی راکھ، میرے بچے کی سالگرہ، تیئیس درد کی خوابوں کے دریچے، مانس بل جب سوکھ گیا، یہ انسان، لہریں اور کنارا جیسے کئی اچھے اور معیاری افسانے لکھنے کے بعد اُس نے افسانوی ادب سے کنارہ کشی کیوں اختیار کی۔ تنقیدی مضامین یا تحقیقی مقالے (جنھیں میں جواب مضمون کہتا ہوں) ہر چند کہ ادیب کی بالغ نظری کا پتہ دیتے ہیں لیکن تخلیقی ادب کا حصہ نہیں بن سکتے۔ برج پریمی ایک تخلیقی

ادیب تھے۔ زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی خوب خوب عکاسی کرتا تھا۔ اور نہایت پیاری ادبی زبان کے مالک تھے۔ انہیں جواب مضمون لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ بہرحال یہ ہماری باہمی رنجش تھی۔ اس دوران انہوں نے ایک معرکے کا کام کیا۔ اور وہ کام تھا منٹو۔ شخصیت اور فن۔ سعادت حسن منٹو ہم دونوں کے چہیتے افسانہ نگار تھے۔ ہم گھنٹوں بلکہ ہفتوں اُن کے افسانوں پر بحث کرتے تھے سر دُھنتے تھے۔ اور خیال ہی خیال میں اُن کے ہاتھ چومتے تھے۔ برج پریمی نے منٹو کے تئیں اپنی محبت اور عقیدت کو معراج تک پہنچا دیا۔ اور ایک ایسی تصنیف تیار کی۔ جو سعادت حسن منٹو کے فن اور اُن کی زندگی کے بارے میں ایک مستند دستاویز ہے اس کتاب کے لئے مواد جمع کرنے میں اُس نے کافی محنت کی کافی دوڑ دھوپ کی۔ بہت سے پاپڑ بیلے۔ مگر جس لگن سے یہ کام شروع کیا تھا۔ اسی لگن سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا یا۔ اِدھر کچھ برسوں سے ہمارے ہاں کا ادبی ماحول کافی بدل چکا تھا۔ بیشتر ادیب اور شعراء نہ جانے کن کن مصلحتوں کے شکار ہو گئے تھے گروہ بندیوں اور خویش پروریوں کی بدعت نے ادبی تصویر کے رنگوں کو خلط ملط کر دیا تھا سرکاری اور نیم سرکاری پشت پناہی نے ادیبوں اور شاعروں کے قلموں کی سیاہی کا رنگ تبدیل کیا تھا مزاج بدل گئے تھے۔ چہرے بھی بدل گئے تھے۔ کئی بار اس بارے میں برج پریمی کے ساتھ بات ہوئی۔ مگر اُس کے اندر کی اچھائی نے باہر کی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بدلتی ہوئی قدروں، زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے مزاج، اور رنگوں نے ادیب کے لئے نئی سوچوں کے اور نئی فکر کے دروازے کھول دیے تھے۔ بہت سے لوگ اس روشنی کی چکا چوند میں فقط آنکھیں ملتے رہ گئے۔ برج پریمی نے نوشتوں کا سہارا لیا اور گزری ہوئی شخصیات کے خدوخال اُبھارنے میں ہی اپنی عافیت سمجھ لی۔ میں نے اُسے ایک خط میں لکھا۔ ادیب کا کام زندہ جاوید لوگوں کی باتیں سُنانا ہے۔ اُن کے دکھ درد پیار محبت، نفرت حسد اور محرومیوں اور لاچاریوں کی بات کرنا ہے۔ وہ جو گزر گئے۔ اُن کی باتیں مؤرخ کرے گا کیوں کہ شخصیات تخلیق کے عمل کا کوئی جز نہیں ہے۔ تاریخ کے عمل کا جز ہے۔ اور تم مؤرخ نہیں ہو۔ بہرحال! یہ بحث مکمل نہیں ہو سکی۔ برج پریمی اپنے کنبے کے ساتھ کن حالات میں کشمیر سے ہجرت کر کے جموں آ گئے۔ اور کیوں آ گئے۔ اور یہاں آکر کیا محسوس کرتے رہے۔ یہ اب کوئی نہیں

جان سکے گا۔ یعنی اُن کی دلی کیفیت اُن کی اندرونی اُتھل پتھل۔ اُن کے ذہن کے اندر کی رسّہ کشی۔ اس کا اظہار تو وہ خود کرتے اگر وہ حیات ہوتے۔ مگر جموں منتقلی کے چند ہی ہفتوں کے اندر وہ یہ تمام راز اپنے سینے میں دبائے راہی ملکِ عدم ہو گئے۔

برج پریمی کے بارے میں ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ ابھی اُن کی موت کا صدمہ جوان ہے۔ ابھی یقین نہیں آرہا کہ وہ ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے ہیں۔ ان کے صاحبزادے پریمی رومانی نہایت پریشان ہیں۔ اُن کے کندھوں پر ایک پہاڑ جتنا بوجھ آناً فاناً آپڑا ہے۔ اور انہیں تسلی دینے والا دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ بہت سارے سوالات ہیں جن کے جواب آتو گئے ہیں مگر ابھی واضح طور پر پہچانے نہیں گئے ہیں۔ جب دُھند چھٹ جائے گی۔ سوالوں کے جواب پہچانے جائیں گے۔ تب برج پریمی اور اردو ادب کی بات ذرا تفصیل سے ہوگی۔

یار اگر زندہ نہیں ہے۔ صحبت تو باقی ہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین

برج پریمی - ایک انسان ایک ادیب

"اس دنیا میں نہ تو انسان اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ وہ یہاں سے اپنی مرضی سے جاتا ہے، اس لئے اُس کی زندگی فضول اور بے معنی ہے"۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لایعنی ادیبوں کے اس قول میں بے پناہ صداقت موجود ہو۔ اسی طرح کبھی کبھی یوں بھی لگتا ہے جیسے وجودیوں کا یہ کہنا کہ انسان کا وجود ہر وقت اپنے ہی عدم وجود کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور یہ کہ فیصلے اور انتخاب کی آزادی کے باوجود انسان اپنے اعمال کے نتائج پر اختیار نہیں رکھتا بالکل صحیح اور صورت حال کے عین مطابق ہو۔ خصوصاً ڈپریشن کے شدید لمحات میں اس طرح کے احساسات و تصورات ہمارے وجود کو زیادہ شدت سے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور چاہے دم بھر کے لئے ہی کیوں نہ ہو ہمیں زندگی کے اُفق پر کوئی کرن چمکتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ روشنی کی کوئی کونپل کہیں سے پھوٹتی دکھائی نہیں دیتی۔

یہ اور اس طرح کے سبھی اقوال چونکہ انسانی تجربے کے نچوڑ کو پیش کرتے ہیں اس لئے کوئی اگر یہ کہہ کر خوش فہمی میں مبتلا ہونا چاہے کہ یہ سب محض لفاظی ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اقوال اپنے اپنے طور پر صداقت کو پیش کرنے کی کوشش تو کرتے

ہیں لیکن اُس کے صرف ایک پہلو تک ہی رسائی حاصل کر پاتے ہیں مکمل صورت کو گرفت میں لانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ زندگی اپنی ذات میں ایک بے رنگ بہتے ہوئے پانی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے رنگ تو انسان کا عمل عطا کرتا ہے۔ انسان کا عمل اس بے معنویت کو معنویت میں بدل دیتا ہے۔ یہی ایک عارضی حقیقت کو دائمی صداقت میں بدل کر اُسے قبول کرنے اور جینے کے قابل بناتا ہے۔ انسانی وجود میں عمل کی اہمیت کو شاید اسی لئے تمام مذاہب اور فلسفیانہ نظریات نے مرکزی و کلیدی حیثیت عطا کی ہے۔ اقبالؔ بھی "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے نہ ناری ہے"

کہہ کر اپنی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسانی زندگی اسی معنویت کی تلاش سے عبارت ہے۔ ہم سب اندھیرے میں چراغ جلانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں تاکہ آنے والوں کی راہوں کو منور کرکے انہیں عمل کے قافلے کو آگے بڑھانے کا حوصلہ عطا کر سکیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک زمانے میں ہماری ابتدائی تعلیم کی نصابی کتابوں میں بڑھیا کا دیا' کے عنوان سے ایک نظم شامل ہوا کرتی تھی جسے ہم سب بچے بہت لہک لہک کر گایا کرتے تھے اور جس میں ایک بڑھیا کے کردار کو پیش کیا گیا تھا جو ہر شام ایک چھوٹا سا دیا جلا کر اپنی دہلیز کے باہر رکھ دیتی تھی تاکہ مسافروں کو اندھیرے میں پریشانی نہ ہو۔ اس وقت یہ نظم محض ایک واقعہ یا پھر اخلاقی سبق معلوم ہوتی تھی۔ جیسے جیسے شعور بڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ تو آدمی کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ ہر انسان عمر بھر اندھیرے میں چراغ جلائے رکھنے کی ہی کوشش تو کرتا ہے اور میرا خیال ہے اس سے بڑا مقصد تو شائد اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور نہ اس سے عظیم تر اور کوئی معنی انسانی زندگی کو پہنائے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی جن کی یاد منانے کے لئے ہم سب آج یہاں جمع ہوئے ہیں بھی اُس بڑھیا کی طرح ایک چراغ جلائے رکھنے کی تگ و دو میں عمر بھر مصروف رہے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن جس چراغ کی لَو کو وہ اپنے عمل کے روغن سے عمر بھر روشن کئے رہے وہ اب بھی کسی گلی کے نکڑ یا کہیں کسی گھر کی دہلیز پر روشن ہے۔ ہمیں اُسے ہر قیمت پر روشن رکھنا ہے۔ برج پریمی کے تئیں اس سے بہتر خراج عقیدت

شاید ہی ہم پیش کر سکیں۔

برج پریمی جن کا پورا نام برج کشن ایمہ ہے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو درابی یار حبہ کدل سرینگر میں ایک اسکول ٹیچر پنڈت شیام لال ایمہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دستورِ زمانہ کے مطابق سرکاری اسکولوں میں حاصل کی۔ ابھی چودہ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور گھر کی ساری ذمے داریوں کا بوجھ کندھوں پر آن پڑا چنانچہ میٹرک کے بعد ہی اپنے والد کے انتقال کی وجہ سے خالی ہوئی جگہ پر بطور اسکول ٹیچر ملازم ہو گئے۔ سولہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ اسکول ٹیچر کی حیثیت سے وادی کے مضافات کے مختلف پرائمری سکولوں میں فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ اس دوران انھیں روزانہ تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ میل سائیکل پر سفر کرنا پڑتا۔ اس وقت تو یہ سب زندہ رہنے کی جدوجہد کا حصہ تھا لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ جدوجہد اندر ہی اندر اُن سے کیا کچھ چھین رہی ہے۔

گریجویشن کے بعد انھوں نے ۱۹۶۱ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سرینگر سے ایم۔ اے اردو پہلی پوزیشن کے ساتھ کیا، پھر ۱۹۷۵ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے اسی کے شعبۂ اردو میں ۱۹۷۷ء سے لیکچرر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ محنت اور لگن نے یہاں بھی انہیں شہرت عطا کی اور کچھ مدت کے بعد ہی وہ ترقی کر کے ریڈر ہو گئے۔ انتقال کے وقت وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔

برج پریمی کی ادبی زندگی کا آغاز اردو افسانہ نگار کے طور پر ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ آپ کا پہلا افسانہ "آقا" سرینگر سے شائع ہونے والے اخبار "جیوتی" میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد آپ کے متعدد افسانے "بیسویں صدی" دہلی، "راہی" جالندھر "فلمی ستارے" دہلی "پگڈنڈی" امرتسر "رنگ" بمبئی اور "ہمارا ادب" سرینگر وغیرہ ملک کے نامور جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ آپ کی کہانیوں کا اگرچہ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا اس کے باوجود مختلف جرائد کی وساطت سے آپ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جانے لگے۔ آپ مزاجاً ترقی پسند نظریات کے حامل تھے اسی لئے آپ نے اپنی کہانیوں کی وساطت سے سماج کے پچھڑے ہوئے طبقوں کے دکھ درد کو ہی سمیٹنے کی کوشش کی۔ آپ کی اس ذہنی مناسبت کا ثبوت اُن عنوانات سے مل جاتا ہے جن کے تحت آپ کے افسانے ملک کے نامور جرائد

میں شائع ہوئے۔ مثلاً میرے بیٹے کی سالگرہ، ہنسی کی موت، سپنوں کی شام، اُجڑی بہاروں کے اجڑے پھول، لمحوں کی راکھ، ٹیسیں، درد کی وغیرہ اسی کیفیت مزاج کی غمازی کرتے ہیں۔

آپ کے افسانوں کے مطالعے سے اس بات کا بھی بخوبی ثبوت مل جاتا ہے کہ آپ افسانے کے فن سے بھی کماحقہٗ واقف تھے۔ اسی لئے آپ نے افسانے کی حدود کو بڑی خوبصورتی سے نبھاتے ہوئے ایسے افسانے تخلیق کئے جو اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن آپ خوب جانتے تھے، افسانے میں الفاظ کے معنویاتی جمود سے انحراف کرتے ہوئے کس طرح اس میں وہ سیال کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے جو اُسے ہمہ رنگ و ہمہ جہت بنا دیتی ہے۔ اس گُر سے بھی آپ کماحقہٗ واقف تھے۔

تخلیقی ادب کے اس ذوق اور تدریسی ضرورتوں نے انھیں تنقید کی طرف بھی راغب کیا اور اس طرح آپ کے تنقیدی مقالے برصغیر ہندوپاک کے نامور جرائد میں شائع ہونا شروع ہوئے جن میں آج کل دہلی، سہیل گیا، سب رس حیدرآباد، جمالیات، تہذیب گڑھ، عصری آگہی دہلی، فکر و فن بمبئی، سیارہ لاہور، اوراق سرگودھا (پاکستان)، سیپ لاہور، نیرنگ خیال لاہور، کشیر مظفرآباد (پاکستان)، فنون لاہور وغیرہ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہونے کے بعد آپ کی تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں میں زیادہ شدت پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ برس کی محدود مدت کے اندر ہی آپ نے سترہ کے قریب کتابیں تصنیف کیں جن میں سے آٹھ شائع ہو کر ملک کے ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ بقیہ کی طباعت کے انتظامات کئے جا رہے ہیں، اُمید ہے جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔

حرفِ جستجو۔ یہ آپ کی پہلی کتاب ہے جو بارہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکاڈمی کے مالی اشتراک سے دیپ پبلی کیشنز نئی پورہ سرینگر کے زیر اہتمام ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ یو۔پی اردو اکاڈمی لکھنؤ نے اس کتاب پر انھیں انعام سے نوازا۔ اس مجموعے کے اکثر مقالے افسانہ نگاروں سے متعلق ہیں جس سے مصنف کی اس صنفِ ادب سے غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان رشحات سے ڈاکٹر برج پریمی کے ادبی و تنقیدی نظریات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے جن کی طرف

ڈاکٹر شکیل الرحمان کتاب کے پیش لفظ میں توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر برج پریمی نے ادبی تنقید کے لئے مارکسزم اور علم نفسیات دونوں کی روشنیوں کو ضروری تصور کیا ہے۔ فن کار کی شخصیت اور اُس کے ماحول کے مطالعے میں مارکسزم کی سچائیوں کو قبول کیا ہے۔ اس لئے اُن کی تنقید کا کینواس صرف پھیلتا ہی نہیں بلکہ مختلف علوم کی روشنیوں کی مدد سے پرکشش اور جاذب نظر بھی بن جاتا ہے۔"[۵]

۲۔ جلوۂ صد رنگ :۔ آپ کے تیرہ[۱۳] مضامین پر مشتمل ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں اور دوسرا ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ یہ مضامین وادیٔ کشمیر کی ادبی و ثقافتی زندگی سے متعلق ہیں جن میں سے چند عنوانات حسب ذیل ہیں: کشمیر غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں، کشمیر رہن سہن اور لباس، شہر لالہ و گل، کلہن اور راج ترنگنی، لل دید افسانہ یا حقیقت، جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ، جموں و کشمیر میں اُردو نثر، جموں و کشمیر میں تحقیق و تنقید وغیرہ۔

جموں و کشمیر کے ادب و ثقافت سے متعلق جو مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں وہ صرف معلوماتی ہی نہیں ادبی و تنقیدی اعتبار سے بھی قابل قدر ہیں۔ انھیں جموں و کشمیر کی ادبی و ثقافتی پیش رفت کا ایک خوبصورت مرقع قرار دیا جانا چاہیئے۔ اس کتاب پر بھی ریاستی کلچرل اکادمی نے انھیں ۱۹۸۶ء کے پہلے انعام سے نوازا۔

۳۔ سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے :۔ یہ برج پریمی کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر کشمیر یونیورسٹی سرینگر نے انھیں ۱۹۷۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آگئی۔ اس مقالے کی اشاعت نے اُردو کے ایک لامثال افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے فن کی تفہیم کے نئے دروازے کھولے جس کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک میں اس کتاب کی خاص پذیرائی ہوئی۔ اس مقالے کی تکمیل بڑی محنت و ریاضت سے ممکن ہوئی ہے مصنف نے نہ صرف تحقیقی تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کیا ہے بلکہ تنقیدی مرحلوں کو بھی بڑے محتاط و متوازن طریقے

۵۔ شکیل الرحمن، پیش لفظ، حرفِ جستجو، دیپ پبلی کیشنز [illegible] سرینگر ۱۹۸۲ء، ص ۹۔

سے طے کیا ہے۔ مقالہ نہ صرف موضوع کے اعتبار سے تحقیق و تنقید کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے بلکہ تحقیق و تنقید کے طریقۂ کار کے جدید اصولوں کو بھی برتتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ منٹو جیسے جینیس ادیب پر اگرچہ کہ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برج پریمی کی اس کتاب کی حیثیت اپنی جگہ ہمیشہ باقی رہے گی اور منٹو کی افہام و تفہیم میں ہمیشہ بنیادی ماخذ کا کردار ادا کرتی رہے گی۔ اس کتاب پر بھی یو۔ پی اردو اکادمی نے مقالہ نگار کو ۱۹۸۷ء میں انعام سے نوازا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی زیر طبع ہے۔

۴۔ ذوق نظر:- یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۷ء میں دیپ پبلی کیشنز سرینگر کے تحت شائع ہوئی۔ اس میں مصنف کے گیارہ مضامین شامل ہیں۔ موضوعات میں خاصی بوقلمونی ہے یعنی تنقید، افسانہ، شاعری، شخصیات اور فلم سبھی سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے برج پریمی میری بات کے تحت خود لکھتے ہیں:-

"مجھے پیشہ ور نقاد اور محقق ہونے کا دعویٰ نہیں البتہ فن ادب، ثقافت اور آرٹ کے مختلف شعبوں سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا ہوں اور اپنا ردعمل اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہوں۔"[۱]

برج پریمی کے تنقیدی مضامین کی خوبصورتی یہ ہے کہ ان کے ہاں تحقیق و تنقید ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کی کہنے سے پہلے انھوں نے اچھی طرح چھان پھٹک نہ کر لی ہو یا جس کے بارے میں وہ پہلے اچھی طرح غور و خوض نہ کر چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی گنجائش بہت کم باقی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کی تنقید کو تحقیقی تنقید اور ان کی تحقیق کو تنقیدی تحقیق کے نام سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہے۔ ان کے اس ذہنی رویے اور تحقیقی و تنقیدی کیفیت مزاج کی جھلک ان کی اکثر تحریروں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس سے ان کے پختہ ذوق نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۵۔ چند تحریریں:- تحقیق و تنقید سے متعلق ۲۳ مضامین کا یہ مجموعہ بھی ۱۹۸۷ء میں

۱؎ ڈاکٹر برج پریمی، میری بات۔ ذوق نظر، دیپ پبلی کیشنز، نئی [illegible] سرینگر ۱۹۸۷ء ص ۵۔

دیپ پبلی کیشنز نئی پورہ سری نگر کی وساطت سے شائع ہوا۔ موضوعات کے تنوع نے اس کو بھی ایک خوبصورت گلدستے کا روپ دیا ہے۔ اس میں تحقیق و تنقید، سفرنامہ، انشائیہ، دیوما لائے نظم، نثری مرثیے اور ترجمہ کے عنوان سے متنوع مضامین کو ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ مضامین بھی برج پریمی کے دوسرے مضامین کی طرح وقتاً فوقتاً ملک کے نامور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جنہیں بعد میں اُن کے صاحبزادے پریمی رومانی نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ طریقہ کار یہاں بھی وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بعض مضامین نہ صرف معلومات کے اعتبار سے دلچسپ ہیں بلکہ ہیئت اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس اور ساحر لدھیانوی سے متعلق مضامین اس سلسلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۶۔ کشمیر کے مضامین[1]:۔ یہ کتاب بھی ان کے بارہ۱۲ مضامین پر مشتمل ہے جو ریاستی کلچرل اکادمی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۹ء میں سامنے آئی۔ اس میں بھی کشمیر کی تاریخ، ادب، ثقافت اور شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ طریقۂ کار تحقیقی و تنقیدی ہی ہے۔ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر حامدی کاشمیری کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

"برج پریمی نقاد بھی ہیں اور محقق بھی اور اپنی تخصیص کی ان دونوں حیثیتوں کا لوہا وہ پورے ملک میں سعادت حسن منٹو پر تحقیقی مقالہ لکھ کر منوا چکے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اُن کا ذہن تحقیق کی طرف زیادہ مائل ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ریاستی اور ملکی ادب سے وابستہ بعض شخصیات کے علاوہ کشمیریات کو اپنا موضوعِ خاص بنایا ہے۔ برج پریمی کی نگارشات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی تحقیقی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے صرف معلومات اور اعداد و شمار جمع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُن کو نقد و احتساب کی کسوٹی پر بھی پرکھتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کی تحقیق بعض نام نہاد محققین کی طرح محض بے فیض بار برداری ہو کر نہیں رہ جاتی

---

[1] اس کتاب پر ریاستی کلچرل اکادمی نے انھیں ۱۹۹۱ء میں بعد از مرگ ایوارڈ سے نوازا۔

بلکہ ایک بامعنی اور ترسیلی کارگزاری بن جاتی ہے۔ وہ جانفشانی سے واقعات کو جمع کرتے ہیں اور پھر ان کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے تاثرات کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے استخراجی عمل کو روا رکھتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان کا طرزِ اظہار حقیقت و استدلال کی خشک اور سرد سطح پر منجمد نہیں ہوجاتا بلکہ شعری اور افسانوی حرارت اور لطافت سے آراستہ ہوجاتا ہے۔[1]

انھوں نے مرغبانی اور شجر کاری کے عنوان سے بھی دو کتابیں اڈلٹ ایجوکیشن کے لئے لکھیں ڈاکٹر برج پریمی کی تنقیدی کاوشوں کے مطالعے سے ان کے طریقہ کار کے جو بنیادی نکات ہمارے سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ وہ مزاجاً ترقی پسند ہیں اس لئے اپنے طریقہ کار کو اکثر و بیشتر اسی دائرے میں رکھتے ہیں۔ اکثر موضوعات کا انتخاب عمل میں لاتے ہیں جو ان کی اس غالب کیفیت مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں۔

۲۔ ان کا اسلوب تحقیقی تنقید کے دائرے میں آتا ہے۔ وہ بڑی جانفشانی سے پہلے مواد جمع کرتے ہیں۔ پھر ان پر تجزیاتی عمل سے نتائج حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ موضوع کی اہمیت کی مناسبت سے زبان اختیار کرتے ہیں۔ تاہم افسانے سے زیادہ رغبت ہونے کی وجہ سے اکثر ایسے استعارے اور علائم بھی برتتے ہیں جن سے اظہار بیان میں شدت پیدا ہوجاتی ہے۔

۴۔ نتائج اخذ کرتے وقت توازن کو ہر حال میں برقرار رکھتے ہیں۔

۵۔ ذاتی پسند کے مقابلے میں ادب کی بنیادی قدروں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔

۶۔ کسی شخصیت کا تجزیہ کرتے وقت زیر بحث شخصیت کی سوانح، اس کے ماحول، دور کی غالب اقدار، انفرادی خصوصیات اور رجحانات تخیل کو خاص طور پر سامنے رکھ کر نتائج اخذ

---

[1] ڈاکٹر حامدی کاشمیری پیش لفظ کشمیر کے مضامین دیپ پبلی کیشنز سرینگر ۱۹۸۹ء ص ۱۲۔

کرتے ہیں۔

۷۔ موضوع اور ہیئت کا تجزیہ کرتے وقت ترسیل و ابلاغ کے مقاصد سے چشم پوشی نہیں کرتے

۸۔ کسی بھی ادبی کاوش کے مرتبے کا تعین اگرچہ کہ اُس کے موضوع اور ہیئت دونوں کے تناسب کو سامنے رکھ کر ہی کرتے ہیں لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر و بیشتر، موضوع کو برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسا شاید اُن کی ترقی پسند کیفیتِ مزاج ہی کی وجہ سے ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی کی شخصیت کا یہ خاکہ اُن کی اُن تحریروں پر مبنی ہے جو شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کا ابھی بہت سا ادبی سرمایہ سامنے آنا باقی ہے۔ جب تک وہ سارا ادب شائع ہو کر سامنے نہیں آجاتا اُن کی شخصیت کا کوئی بھی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مندرجہ بالا تصریحات سے اُن کی شخصیت کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے ضرور آجاتا ہے۔ اُن سے ہمیں بہت سی توقعات تھیں۔ زندگی نے اگر انھیں تھوڑی مہلت اور دی ہوتی تو وہ اردو کے خزانے میں ضرور مزید اضافے کا باعث ہوتے۔ پھر بھی وہ جو کچھ دے گئے ہیں، قابلِ صد ستائش ہے۔

●

عرش صہبائی

کہاں گئے وہ لوگ

یوں تو مشاعروں کے سلسلے میں کئی بار سرینگر جانا ہوا لیکن ملازمت کے سلسلے میں ۳۱، اگست ۱۹۸۷ء سے ۳۱، دسمبر ۱۹۸۸ء تک وہاں قیام رہا۔ اس سے پہلے سلی گوری (مغربی بنگال) کے بعد روہتک آل انڈیا ریڈیو میں طویل عرصہ گزرا۔ یہ طویل عرصہ میری زندگی کا بدترین وقت تھا لیکن اس بات کی تلخی کو سرینگر نے بھلا دیا۔ میں قدرتی مناظر کا شروع ہی سے دلدادہ رہا ہوں اس لحاظ سے بھی مجھے سرینگر میں کافی سکون ملا۔ لیکن وہاں کا ادبی ماحول بے حد مایوس کن تھا۔

وہاں ہر ادیب نے بالخصوص شاعروں نے اپنے آپ کو ایک محدود دائرے میں بند کر رکھا تھا اور ہر شاعر یہ سمجھتا تھا کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ عام طور پر وہاں کے ادیب علاقائی تعصب اور گروہ بندی کا شکار تھے جس طرح جموں میں ڈوگری (مقامی بولی) بولنے والے ہر شخص اپنے آپ کو ڈوگری کا ادیب تصور کرتا ہے اسی طرح وہاں کشمیری بولنے والوں میں بھی یہی احساس پایا جاتا تھا۔ جب کبھی میں ریڈیو یا دوردرشن کے اردو مشاعروں میں شریک ہوتا تو وہاں کے شاعروں کا کلام سن کر کسی حد تک مایوسی ہوتی۔

جب میں ۳۱، دسمبر ۱۹۸۸ء کو دُوردرشن سرینگر سے بطور ایڈمنسٹریٹو آفیسر ملازمت سے سبکدوش ہوا تو ریڈیو کشمیر سرینگر اور دُوردرشن کی طرف سے کلام کی صدابندی اور انٹرویو کے لئے مجھے مدعو کیا گیا۔ اگرچہ یہ دونوں دعوت نامے میرے لئے زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے لیکن یہ بات میرے لئے مسرت کُن تھی کہ دُوردرشن کے انٹرویو کے لئے ریاست کے ایک مستند ادیب ڈاکٹر برج پریمی کو مدعو کیا گیا تھا۔ برج پریمی سے کئی برس پہلے جموں میں میری مُلاقات ہو چکی تھی لیکن یہ مُلاقات میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ مجھے اس وقت کافی مایوسی ہوئی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود میرے دل میں یہ خلش باقی رہی کہ ڈاکٹر برج پریمی سے مُلاقات نہیں ہو سکی۔ وادی کے حالات کے پیشِ نظر جب کشمیر سے ہجرت شروع ہوئی تو جناب برج پریمی بھی اپنے کنبہ کے افراد کے ساتھ جموں آگئے۔ اس کی اطلاع مجھے اُن کے فرزند پریمی رومانی سے موصول ہوئی۔ رومانی صاحب سے پہلے بھی کئی بار مُلاقاتیں ہو چکی تھیں جب انھوں نے اپنی رہائش کی پریشانیوں کے بارے میں بتایا کہ اُن کا کنبہ ایک ایسے کمرہ میں وقت گزار رہا ہے جہاں صرف بیٹھنے کی گنجائش ہے میں یہ جان کر ایک عجیب سے احساس میں مبتلا رہا اور برج پریمی صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔ حالانکہ میرے دل میں اُن کے لئے بے حد احترام تھا۔ میں اُن کی ادبی صلاحیتوں کا گرویدہ تھا۔ وہ اُردو ادب کے خاموش معماروں میں سے تھے جو بغیر کسی صلے کے ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔ ایک روز رومانی صاحب کی طرف سے ایک رقعہ موصول ہوا جس میں درج تھا کہ برج پریمی صاحب ۲۰، اپریل ۱۹۹۰ء کو اس دُنیا سے ہمیشہ کے لئے کُوچ کر گئے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ میں اس قسم کی خبر سننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن اُن کے لئے میرے دل میں جو احترام تھا اُس کے مُطابق انھیں بزرگ کہا جا سکتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ وطن مالوف سے ہجرت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے۔ انھیں کشمیر سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ مجھے زندگی بھر اس بات کا قلق رہے گا کہ میں شہر میں ہوتے ہوئے بھی اُن کے آخری سفر میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے وقت پہ اس کی اطلاع نہیں مل سکی اور جن حالات

میں اسپتال میں اُن کی موت واقع ہوئی اُن حالات میں پریمی رومانی کے لئے ممکن بھی نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر برج پریمی کے چاہنے والوں کو مطلع کر سکتے۔

کبھی کبھی حالات بھی انسان کے ساتھ کیا مذاق کرتے ہیں۔ ایک مضمون سے مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب جناب دیاکرشن گردش اور خاکسار کے بارے میں لکھنا چاہتے تھے حالانکہ روائیت کے مطابق یہ کام کسی ادیب کی موت کے بعد کیا جاتا ہے ورنہ خدشہ رہتا کہ وہ خوشی کے مارے دم نہ توڑ دے اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب روائیت شکن بھی تھے۔ اگر ریاست کے ادیبوں اور شاعروں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اکثر و بیشتر لوگ صرف تخلص کے گنہگار ہیں اور ادب کا منہ چڑا رہے ہیں لیکن مختلف ادبی اور نیم ادبی اداروں تک انہیں رسائی حاصل ہے جس وجہ سے وہ ادیب گردانے جاتے ہیں ریاست میں قابلِ ذکر ادیب کم بلکہ بہت ہی کم ہیں اور ان بہت کم ادیبوں میں ڈاکٹر برج پریمی کا اسم گرامی سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے عروسِ ادب کو سنوارا ہی نہیں بلکہ صدق دلی کے ساتھ اس کی عبادت بھی کی ہے۔ ایک خاموش پرستار کی طرح اسے چاہا بھی ہے پریمی صاحب نے اپنی ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے ادب میں نام پیدا کیا اور ایک خاص مقام حاصل کیا۔ انھوں نے اس میدان میں کسی قسم کی بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیا بلکہ دوسروں کے لئے بیساکھیاں ثابت ہوئے۔ اُن کا پیشہ تعلیم و تدریس جیسا مقدس پیشہ تھا۔ لاتعداد طالب علموں نے اُن سے اکتسابِ علم کیا۔ اُن کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ اس طرح انھوں نے ایک نئی پود کی صحت مند ذہنی پرورش کی۔ اُن کی تمام تحریریں چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہیں صحت مند رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ جب ہم اُن کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں مشاہدہ کے ساتھ ساتھ گہرائی سنجیدگی اور خیالات کا ٹھہراؤ بھی ہے۔ وہ پاکیزگی کے دامن کو کسی صورت بھی ہاتھ سے نہیں نکلنے دیتے۔ اُن کی ذاتی زندگی بھی اخلاقی قدروں سے عبارت رہی ہے۔ وہ ادب کے ساتھ ہمیشہ ایماندار اور مخلص رہے ہیں۔ اسی باعث اُن کی ذاتی زندگی اور اُن کے فن میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ حالانکہ ادب میں ایسا کم ہوتا ہے۔ کشمیر اور اہلِ کشمیر اُن کی ذات پر فخر کریں یا نہ کریں لیکن اُردو ادب کو ہمیشہ یہ فخر حاصل رہے گا کہ

اس کے حیالے فن کاروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر برج پریمی کا بھی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شروع ہی سے ریاست کے ادبی ماحول میں ادبی اداروں کی نااہلیت کی وجہ سے ایک گھٹن رہی ہے چاہے یہ ادارے سرکاری تھے یا نیم سرکاری۔ ورنہ مجھے یہ کہنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

کور ذوقی بن گئی اے عرش صدرِ انجمن
قدرِ شاعر ہو گئی عنقا مرے کشمیر میں

برج پریمی اس ماحول میں بھی جینے کی طرح جیئے اور دُنیا و مافیہا سے یکسر بے نیاز ہو کر اپنے ادبی سفر میں ایک تیز رو مسافر کی طرح گامزن رہے۔ اُن کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ ان کی منزلِ مقصود قریب آتی گئی لیکن اس اثنا میں اُن کی زندگی کا سفر مکمل ہو گیا۔ جس ادبی منزل پر گامزن رہے، وہ آج بھی حسرت بھری نظروں سے اپنے رہرو کو تلاش کر رہی ہے۔ اور اس کے انتظار میں ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس کے چاہنے والا کسی اور سفر پر روانہ ہو چکا ہے جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس ادبی منزل پر گم شدہ مسافر کے پاؤں کے نشان سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی تصنیف "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے کی کسی کو جسارت نہ ہوگی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دستاویز اپنے آپ میں کتنی مکمل اور جامع ہے۔ اگرچہ یہ دستاویز منٹو کی حیات اور ادبی کارناموں پر مشتمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تصنیف پریمی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس نے ثابت کر دیا ہے کہ موصوف ایوانِ اُردو کا ایک مضبوط ستون ہیں۔ اُن کی برسوں کی محنت نے اسے امر کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کو مرتب کرتے وقت ڈاکٹر صاحب کو کن مشکل اور دُشوار گزار راستوں کو طے کرنا پڑا ہوگا۔ زبان پر دسترس نے اُن کی تحریر کو اور بھی پُر اثر اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ یہاں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس میں پریمی صاحب کی تحقیقی صلاحیتوں کے جوہر بھی کھلتے ہیں۔ ایسے مطالعہ کرتے وقت ایسے لگتا ہے کہ پریمی صاحب رُوبرو بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۷۵ صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور اس کا ہر صفحہ قابلِ توجہ ہے۔ منٹو کی زندگی اور ادبی خدمات کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو تفصیل کے ساتھ نمایاں نہیں کیا گیا۔ کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جو آج تک قارئین کی نظر سے اوجھل تھے۔ اس میں کچھ نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تصاویر حاصل کرنے میں وقت بھی درکار اور محنت بھی۔ میں نے اپنی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ زیرِ بحث مجموعہ اتنا مکمل اور جامعہ ہے کہ اس کے بعد گنجائش نہیں کہ منٹو پر مزید کام کیا جائے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں قارئین کی خدمت میں ایک واقعہ بھی پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ 'منٹو نامہ' کے نام سے دہلی کے کسی جگدیش چندر ودھاون صاحب نے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں پریمی صاحب کے مجموعہ سے جملے کے جملے اُڑا کر اس میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ودھاون صاحب کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو وہ 'منٹو نامہ' میں اپنی طرف سے شامل کرتے۔ اس لئے انھوں نے بیچ پریمی صاحب کی محنت پر ہاتھ صاف کیا۔ اور خدا نے انہیں اتنی اخلاقی توفیق بھی نہیں دی کہ وہ اس کا اعتراف کرتے یا پریمی صاحب کا حوالہ دیتے جنہوں نے کئی حقائق یکجا کرنے میں کئی برس صرف کئے۔ یہاں ودھاون صاحب کی دیدہ دلیری کی داد دینا پڑے گی۔ اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اُسے ایسی عظیم شخصیتیں بھی ملی ہیں۔ بہر حال یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ یہ بات برسبیل تذکرہ آگئی اس لئے کہ دونوں مجموعے میرے سامنے موجود ہیں۔

ضرورت تو اس بات کی تھی کہ پریمی صاحب کی تمام تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا اور وہ حق ادا ہو جاتا جو مجھ جیسے حقیر فنکار پر واجب تھا لیکن اُس صورت میں یہ جائزہ ایک کتابی صورت اختیار کر لیتا جس کے لئے کئی صفحات درکار ہوتے۔ میں خود بھی ایک تشنگی محسوس کر رہا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قرض کا یہ قرض اب بھی میری طرف واجب لادا ہے۔

آسمانِ ادب پر جو سورج ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو طلوع ہوا تھا، وہ ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو ڈوب گیا لیکن اپنے پیچھے روشنی کی ایسی کرنیں چھوڑ گیا جو اس منزل کے رہرووں کو راستہ

دکھاتی رہیں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس عظیم فن کار کو مرحوم کہہ سکوں۔ بہرحال میں اپنے اس شعر کے ساتھ اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

نام جن کے زندہ و جاوید ہیں
ان کو کہئیے آنجہانی کس لئے

عبد الغنی شیخ

یادوں کے لمس

۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں سرینگر میں ویٹرنری سٹاف اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ میٹرک پاس کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا شوق تھا لیکن غربت کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہیں لے سکا تھا۔ سرینگر میں اُن دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب کے گھر ادبی مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جلد ہی مجھے اُن کی بو باس مِل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے ان مجلسوں میں کھینچ لے گیا۔ ادب کا چسکا میں لیہہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوت بھی لگی تھی لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی۔ اس نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے جینے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ ایک ادبی مجلس میں میں نے اپنی ایک کہانی "آرزوئیں" پڑھی۔ یہ مجلس رحمان راہی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کہانی پر وید راہی ایک منی فلم بنا رہا ہے۔ مجلس میں کہانی یا نظم سنانے کے بعد اس پر سیر حاصل تبصرہ اور مباحثہ ہوتا تھا۔ ان مجلسوں میں نوجوان، ادھیڑ اور عمر رسیدہ ادیب، ادب نواز اور شاعر شرکت کرتے تھے۔ میرے ذہن کی تختی پر دھندلی سی یہ یاد محفوظ ہے کہ نوجوان ادیبوں میں ایک برج پریمی بھی تھا۔

اُن دنوں ترقی پسند ادب کا بڑا چرچا تھا۔ چھوٹے بڑے ادیب اس تحریک سے متاثر تھے۔ پرولتاری

بورژوا اور رجعت پسند جیسے الفاظ انہی دنوں میں نے سنے۔ میرے ہمعصر ہر نوجوان کو ادب سے گہرا شغف تھا اور ہر ایک کو لکھنے اور اپنا نام چھپانے کی بڑی امنگ تھی۔ اُن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ تخلیق کے لئے میرے دماغ میں جو جوار بھاٹا سا اٹھتا ہے۔ ویسا ہی جوار بھاٹا ہر ایک کے دماغ میں موجزن ہے۔ شاید ہم ایک کا کوئی اپنا ادبی ہیرو تھا۔ میں کرشن چندر کا پرستار تھا اور اُن کی بیسوں کتابیں پڑھ چکا تھا۔ برج پریمی کا چہیتا ادیب سعادت حسن منٹو تھا جیسا کہ پریمی پرتھوی ناتھ کی سرگذشت سے معلوم ہوا کہ پریمی اور وہ عالی کدل میں پریمی کے آبائی مکان میں منٹو کے افسانوں پر ہفتوں بحث کرتے۔ منٹو کی کہانیوں پر سر دھنتے اور دل کھول کر داد دیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے کرشن چندر کو ایک تعریفی خط لکھا۔ ہندوستان کے انتہائی شمالی نقطہ پر رہنے والے ایک قاری کی حیثیت سے جواب بھی اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن خط کا جواب نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ میں دوسرا خط لکھتا، میں نے کرشن چندر کی کہانی 'کبوتر کا خط' پڑھی جس میں اس قسم کے خط لکھنے والوں کا مذاق اڑایا تھا تب میں نے خط لکھنے کا ارادہ ترک کیا۔ میں اپنے محبوب ادیب کرشن چندر پر کرشن چندر نمبر کے لئے پونے تین صفحات کا ایک مختصر مضمون لکھ سکا جبکہ برج پریمی نے منٹو پر ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھی۔ اس طرح منٹو کے تئیں اپنا حق ادا کیا۔ اور ہم جیسے کئی لکھنے والے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی اور لکھنے والے اور قاری دونوں نے سراہنا کی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ادا کئے ہیں:۔

"منٹو پر لکھی گئی کتابوں میں کوئی بھی کتاب اتنی مکمل اور ہمہ گیر نہیں جتنی پریمی کی کتاب ہے۔"

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:۔

"منٹو پر ایسی جامع کتاب اب تک اردو میں نہیں لکھی گئی۔ منٹو پر آئندہ بھی تحقیقی کام ہوگا۔ لیکن آپ کا یہ مقالہ بنیاد کا کام دے گا۔"

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن رقم طراز ہیں:۔

"منٹو پر اُن کی تصنیف لاثانی اور منفرد ہے۔ یہ منٹو کے عوامل اور واقعات زندگی

کا ایک گرانمایہ خزینہ ہے۔"

برج پریمی ان ادیبوں میں تھے جو ریاضت کرتے ہیں جو خونِ جگر دے کر ادب کے شاہ پارے تخلیق کرتے ہیں جنہیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ صلہ کی خواہش۔ پریمی غریب تھا۔ ان کے والد ایک اسکول ٹیچر تھے۔ پریمی کے پاس وسائل اور سفارش نہیں تھی۔ ایسے لوگ صرف اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنی محنت کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ چیخوف اپنی جوانی کی مفلوک الحالی اور تارگنیف اور لیو طالستائی کی امارت اور آرام دہ زندگی کا اپنے سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "انہیں قدرت کی طرف سے وہ شے تحفے میں مل جاتی ہے جو ہم جیسے نیچے کے طبقے سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنی جوانی کی آسائش قربان کر کے خریدنی پڑتی ہیں۔

پشکر ناتھ، پریمی سے متعلق لکھتا ہے:۔

"پریمی کو زندگی میں آگے بڑھنے کی کتنی تمنا تھی۔ آگے بڑھنے کے لئے اُس کے پاس ایک ہی راستہ تھا تعلیم اور مزید تعلیم کیونکہ سفارش اور رشوت اور سیاسی، سماجی یا اقتصادی پشت پناہی نہ اُس کے پاس تھی اور نہ میرے پاس۔ چنانچہ سنگل ٹیچر اسکول کی ماسٹری سے برج پریمی ترقی کرتے کرتے کشمیر یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔"

برج پریمی نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کی تحریروں میں صمد میر اور کشمیری لوک گیتوں سے لے کر فرغ بانی اور شجر کاری تک کے موضوعات شامل ہیں۔

پریمی کے طرزِ تحریر اور اسلوب پر کرشن چندر اور منٹو کا اثر ہے۔ نشستِ الفاظ کی خوبی ترکیب کی دل آویزی اور سلاست اس کے خاص جوہر ہیں۔ زبان میں دلکشی، پرکار سادگی اور رنگینی ہے زندگی کے آخری ایام میں وہ کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما پر تحقیقی کام کر رہے تھے اور اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھنا چاہتے تھے جو برج پریمی جیسے محنتی اور ذہین قلم کار سے امید کی جا سکتی تھی۔ اپنی کتاب کی تخلیق کے سلسلے میں برج پریمی نے ریاست کے تمام اُردو ادیبوں

اور شاعروں سے رابطہ قایم کیا تھا۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی میں پریمی سے میری ملاقات ہوئی، روبرو ملے تیس سال سے زیادہ کی طویل مدت بیت چکی تھی۔ جہلم اور سندھ میں تب سے بہت پانی بہہ چکا تھا۔ اس دوران بن گاہے گاہے پریمی کی تخلیقات مختلف رسائل میں دیکھتا اور پڑھتا رہا اور پریمی سے غائبانہ ملاقات جاری رہی۔ ادیب پریمی کو ان کی تخلیقات کے آئینے میں دیکھا تھا۔ انسان پریمی سے مل کر خوشی ہوئی۔

پریمی نے کئی دفعہ مجھ سے میری مطبوعہ کتابیں مانگیں۔ میرے پاس اپنی کتابوں کی دو تین سے زیادہ فاضل کاپیاں نہیں تھیں۔ کاپیاں ڈھونڈنے میں کوتاہی ہوئی جب کتابوں کا انتظام ہوا تو میں نے پریمی کے رفیق کار پروفیسر رشید نازکی سے استدعا کی کہ وہ میری کتابیں برج پریمی تک پہنچائیں "آج کل پریمی علیل ہیں۔ بعد میں دے دیں گے"۔ رشید نازکی بولے۔ اس کے بعد میں نے برج پریمی سے متعلق کچھ نہیں سنا اور نہ ہی سنا جب وہ اس دنیا سے چلے گئے تھے۔

برج پریمی کی زندگی کا چراغ وقت سے پہلے بجھ گیا۔ ابھی ان کے پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ ابھی انہیں بہت کام کرنا تھا۔ ان کے سامنے لکھنے اور چھپانے کے لمبے چوڑے منصوبے تھے۔ پریمی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سپنوں کی شام (افسانوں کا مجموعہ) اوپندر ناتھ اشک کے خطوط، پردیسی شخص و فن کار، صمد میر۔ شخص و فن کار اور منٹو کتھا شامل ہیں۔

مجاز، منٹو، چیخوف، شیلے، چکبست، شمیم جیسے نہ جانے کتنے سارے شاعر اور ادیب کو وقت سے پہلے موت نے چھین لیا۔ موت اٹل ہے۔ اسے مفر نہیں لیکن جب ایک فن کار جوانمرگی کا شکار ہوتا ہے یا وقت سے پہلے موت سے ہمکنار ہوتا ہے تب بڑی کوفت ہوتی ہے۔ مرنے والے کی زندہ تخلیقات ہی یاد نہیں آئیں بلکہ اس تصوراتی اور قیاسی تخلیقات کا حسرتناک خیال بھی آتا ہے جس کا سوتا مصنف کی موت کے ساتھ سوکھ جاتا ہے۔

ارجن دیو مجبور

لمحات کی چھاؤں میں

"جانے کل ہوں کہاں لفظ آب ہوا کے ہیں
ہم پرندے مقاماتِ گم شدہ کے ہیں"

بانی کا یہ حسبِ حال شعر اپنے رفیق اور ساتھی ڈاکٹر برج پریمی کے اچانک جدا ہونے پر صادق آتا ہے۔ پریمی کو جن حالات نے ہم سے چھین لیا وہ دورِ حاضر اور ہمارے ادیبوں کی دردناک زندگی کو عریاں کر کے رکھ دیتے ہیں۔ پریمی کا نام یاد آتے ہی کئی دفتر کئی واقعات اور کئی محفلوں کے شب و روز میرے سامنے آجاتے ہیں۔ میری اُن سے پہلی ملاقات کب ہوئی کچھ یاد نہیں رہا۔ میں اُن دنوں سرینگر کے ڈی۔ اے۔ وی اسکول گھر مل باغ سرینگر میں کام کر رہا تھا۔ جوش و جنون کے رنگ دماغ پر چھائے تھے۔ دو تحریکوں سے میری گہری وابستگی تھی۔ ایک ترقی پسند ادب کی تحریک اور دوسری کشمیر کے ستم زدہ اساتذہ کی تحریک۔ اُن دنوں ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ دفتر نمائش گاہ کے ایک بڑے سٹال میں قائم تھا۔ یہاں کشمیری زبان کے ادیب اکثر ملتے رہتے تھے۔ اور پاس والے کمروں میں IPTA اور ترقی پسند مصورین کی بیٹھکیں بھی ہوتی تھیں میرا حافظ

یہی کہتا ہے کہ پریمی سے یہیں شناسائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد تعلقات کچھ اتنے گہرے ہوئے کہ جب فرصت پاتا تو اُن کے گھر جا کر اُس کی اور اپنی مشکلوں کی داستانوں پر گفت گو کرتا۔ ہم دونوں ایک نئی دُنیا، ایک نئے خوشحال کشمیر کے خواب دیکھنے لگے تھے اور اس لئے اکثر اپنے ذاتی مشکلات کی ہم زیادہ پرواہ نہ کرتے۔ وہ سرکاری اُستاد تھے اور میں ایک پرائیویٹ اسکول میں کام کرتا تھا جہاں سانس لینے کی فرصت نہ تھی۔

اُن دنوں پریمی نیتح کدل ملک آنگن میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ میں گنپت یار میں مقیم تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک آنگن (سرینگر) کے مکان میں میں نے اور پریمی نے زور دار بحثیں کی ہیں۔ ان بحثوں کا محور کمیونزم ادب، کشمیر اور اساتذہ کے مسائل ہوتے تھے۔ میں جب آج اُن دنوں کی یاد تازہ کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ جوانی میں ہم لوگ کتنے جذباتی تھے۔

پریمی ابتدا سے ہی شرافت، نفاست اور تحمل کا مجسمہ تھے لیکن اس سماج کے لئے مجھ میں بے حد غصہ تھا جس نے ہمیں ہر حال میں پچھڑ کے رکھ دیا تھا۔ میری ذہن میں انقلاب کے نغمے گونجتے ہی نہیں آگ اگلتے تھے اور پریمی اپنے جذبات کو کہانیوں میں ڈھال رہے تھے۔ وہ کئی ابتدائی افسانے مجھے سُنا چکے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں کشمیری سماج کے رستے ناسوروں کو چیرنے کی کامیاب کوشش ہوتی تھی۔ جب میں جذبات کی رَو میں بہہ جاتا تو پریمی مجھے صبر اور تحمل سے کام لینے کو کہتا۔ ہم کشمیر کے ادیبوں جیسے آنجہانی پریم ناتھ پردیسی، گنگا دھر بٹ دیہاتی، شہ زور کاشمیری وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتے۔ کچھ برس بعد میں سرکاری محکمہ تعلیم میں بھرتی ہوگیا اور زیادہ تر شہر سرینگر سے باہر رہنے لگا۔ پریمی اِن دنوں قصبہ ناگام کے ہائی سکول میں کام کرتے تھے لیکن رہتے سرینگر میں ہی تھے وہ جب بھی ملتے تو مجھے اپنے گھر لے جاتے اور ہم آدھی آدھی رات تک ادبی اور سیاسی مسائل پر محو گفتگو رہتے۔

جن دنوں وہ مشہور اُردو افسانہ نگار سعادت حسن منٹو پر تحقیق کر رہے تھے اُن دنوں وہ مجھے رگھناتھ مندر کے قریب کسی دوست کے گھر لے گئے۔ مجھے اُس دوست کا نام یاد نہیں رہا۔ یہاں میں نے

دیکھا کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اردو ادب کی مختلف اصناف کی جدید کتابیں بڑے ہی سلیقے سے الماریوں میں رکھی گئی ہیں۔ کافی دیر تک پریمی مجھے اپنی تحقیق کی جانکاری دیتے رہے۔ جب میں اُن کی باتیں سن رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ واقعی پریمی کوئی معرکہ سر کرنے والے ہیں اور یہی ہوا۔ جب منٹو پر پریمی کی تحقیق منظرِ عام پر آئی تو اردو کے سبھی ممتاز ادیبوں نے اُن کے کام کی بے حد داد دی۔ پریمی اب یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام کرنے لگے تھے۔ متانت اور علمی وقار اُس کے گول چہرے پر منعکس ہوتا تھا اور اب باتیں بہت کم لیکن معنی خیز ہوا کرتی تھیں۔ ہم اکثر کلچرل اکادمی کے دفتر میں شری موتی لال ساقی کے کمرے میں اور دیگر سیمناروں اور ادبی تقریبات میں ملتے تھے۔ پریمی اب مکمل طور اردو ادب کی وساطت سے کشمیر کے ماضی اور یہاں کی ثقافت سے متعلق محققانہ مضامین لکھنے لگے تھے اور لگاتار لکھے جا رہے تھے۔ انہیں ہر کتاب پر مختلف تمدنی اداروں سے داد و تحسین اور اعزازات مل رہے تھے۔ یہ میرے لئے بھی فخر کی بات تھی۔

جن دنوں ہم اساتذہ کی انجمن کی اور سے رسالہ "اُستاد" شایع کر رہے تھے اُن دنوں کبھی کبھی پریمی بھی اپنی نگارشات شایع کرنے کے لئے بھجوا دیتے تھے اور ہم انہیں شایع کرنے میں خوشی محسوس کرتے۔

ڈاکٹر پریمی نے "کشمیر کے مضامین" نام کی تحقیقی کتاب میں اس رسالہ کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے چند خطوط جو میں نے محفوظ رکھے تھے کشمیر میں ہی رہ گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک خط میں انھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ میں انہیں اردو زبان میں اپنے تمام مضامین کے عنوانات وغیرہ کے بارے میں جانکاری فراہم کروں۔ میں نے فوراً اُن کے اس خط کے جواب میں تفصیل سے لکھا تھا۔

دو ملاقاتیں اور یاد آ رہی ہیں۔ ایک جب وہ اپنے کوارٹر کے سٹیڈی روم میں ملے تھے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور اُنھوں نے اپنے ادبی عزائم سے مجھے روشناس کرایا۔ اپنی دو نئی تصانیف دے کر مجھے بڑے خلوص پیار اور محبت سے رخصت کیا۔ اسی کوارٹر میں اُن کی والدہ صاحبہ کے فوت ہونے پر ماتم پرسی کرنے گیا تھا۔ والدہ کی موت کے بارے میں تفصیل بتانے کے بعد ہم پھر ادبی معاملات پر گفتگو میں محو ہو گئے تھے۔

پریمی خلوص اور شرافت کا پتلا تھا جس کے دل کو ڈل کی وسعتوں نے گہرائی عطا کی تھی جس کے قلم میں کمل کے شہد کی مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔ وہ کشمیر کی ہر چیز کا سچا پریمی تھا۔ اس نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا تھا۔ وہ مشکلوں سے گھبراتا نہ تھا۔ اس کے دوستوں میں نامور ادیب اور شناسا شامل تھے۔ وہ اگرچہ کم گو تھے لیکن اُن کا چہرہ اُن کی زندگی کی ایک کھلی کتاب کی مانند تھا۔ کشمیری زبان کے نامور شاعر جناب دینا ناتھ نادم مرحوم کے گھر پر بھی ڈاکٹر پریمی آیا کرتے تھے اساتذہ کی انجمن کی کارروائیوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اُن کی ادبی بلوغیت کے بعد اُن کے قلم اور اُن کی زبان میں رنگینی چاشنی، تحقیقی تدبر اور روانی آگئی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اُردو ادب کی خاصی خدمت کرتے۔

پریمی کا نام آتے ہی میری آنکھوں میں شرافت اور سنجیدگی کی ایک کائنات رقص کرنے لگتی ہے اور مجھ سے سوال کرتی ہے کہ میں ابھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ پھر موت نے مجھے کیوں آ دبوچا۔ میں یہ الفاظ سنتے ہی بے حد پریشان ہو جاتا ہوں، کسے معلوم تھا کہ جس اودھمپور میں میں پوتر دیوکا ندی کے کنارے سکونت اختیار کروں گا اُسی ندی میں میرے عزیز دوست اور نامور ادیب ڈاکٹر برج پریمی کے جسد خاکی کے پھول بہائے جائیں گے۔ مستقبل کے بارے میں کون صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ جب میں اپنی یادوں میں ڈاکٹر پریمی کی جد وجہد بھری زندگی کا گہرا عکس دیکھتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن جب میں تصور میں اس بات کی اور جاتا ہوں کہ وہ شخصیت جسے ابھی کئی سال جینا چاہیئے تھا کن حالات میں ہم سے جدا ہوئی تو میرے دل میں ایک اتھل پتھل مچلتی ہے اور میرا وجود کراہنے لگتا ہے اور میں باقی کا شعر پھر گنگنانے لگتا ہوں ؎

"جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
ہم پرندے مقامات گم شدہ کے ہیں"

سیّد رسول پونپُر

برج پریمی اور اُن کا اسلوب

اسلوب کسی ادیب یا شاعر کی مکمل شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ اسلوب شخصیت کا آئینہ ہے جس میں کسی بھی ادبی یا شعری شخصیت کے خدوخال نہایت باریک بینی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسلوب سے مُراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے متمیز ہو جاتا ہے۔ اِس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں اور اگر آپ اس بات کی مشق کرتے رہیں گے کہ آپ بِنا پوچھیں شعر یا نثر کا یہ ٹکڑا کس نے لکھا تھا تو آپ بتدریج اتنے مشاق ہو جائیں گے کہ انیسؔ اور دبیرؔ، غالبؔ اور ذوقؔ، میر حسنؔ اور دیا شنکر نسیمؔ کے کلام میں امتیاز کر سکیں۔ یا حالیؔ، سرسیّدؔ، غالبؔ[1] اور ابوالکلام کے نثر پاروں میں اُن کی انفرادیت دیکھ سکیں۔ ایک منفرد طرزِ نگارش اور اسلوب کا مالک ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ اِس کے لئے بہت سے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ اوّلین شرط فطری میلانِ طبع اور اپنی ذات میں مخفی جبلی تخلیقی قوتوں کا عرفان ہے ورنہ ایک آدمی تخلیق کار کی حیثیت سے کیا کیا بننا نہ چاہے اور سب کچھ یعنی شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، محقق، نقاد، ماہرِ آثارِ قدیمہ، مؤرخ اور مُصوّر و سنگتراش ہوتے ہوتے کسی ایک کا نہ ہو سکے۔ دلو پیکر اور بے مثال ہمہ جہت تخلیقی جوہر اللہ نے ودیعت کیا ہو تو اعتراض کون کرے۔ اس امر سے اِنکار ممکن نہیں کہ شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، انشا پردازی

---

[1] اسلوب۔ ۱۹۷۶ء: مصنف سید عابد علی عابد، ص ۴۴: مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

صحافت و دیگر صنفوں کے لئے بنیادی تخلیقی قوت کی کارفرمائی کے باوصف اسلوب و ہئیت میں اختلاف بھی لازمی چیز ہے جس کا ادراک کئے بغیر کسی بھی صاحبِ طرز قلمکار و انشاپرداز کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اسلوب کی بات چلی ہے تو تخلیقی عمل میں فنی لوازمات کے حسن کارانہ برتاؤ سے بھی مفر ممکن نہیں کیونکہ اس کے بغیر احساس جمال کی تشفی، نامکمل ہی سہی، ہو نہیں سکتی۔ سیموئیل بٹلر ان امور کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

"فنکار کو چاہیئے کہ وہ اپنی تحریر میں زورِ اختصار اور حسنِ تعبیر کی صفات پیدا کرے (کہ بُری چیز بھی اچھی معلوم ہو) وہ ایک ایک فقرے کو تین چار بار لکھ کر دیکھے گا کیونکہ اس سے کم مشق میں بات نہیں بنے گی۔ وہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھے گا کہ اپنی بات کی تکرار نہ کرے۔"

وہ اپنے مواد کو اس طرح مرتب و منظم کرے گا کہ قاری تک اس کا منتقل ہونا آسان ہو جائے گا۔ وہ بیکار الفاظ چھانٹ دے گا بلکہ بے کار مواد سے بھی پرہیز کرے گا۔ اس سلسلے میں اسے اپنے اسٹائل یا اسلوب کی اتنی فکر نہیں ہوگی جتنی پڑھنے والوں کی سہولت کی۔ نیومین اور آر۔ ایل۔ سٹیونسن جیسے مصنف سمجھتے ہیں کہ پہلے اپنا ایک اسلوب متعین کرنا چاہیئے اور پھر اپنی تحریر کو اس سے مزین کرنا چاہیئے۔ میں اس بات کو وضاحت سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اسلوب کے متعلق ذرہ بھی تردد نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میرا کوئی اسلوب ہے یا نہیں مجھے تو اس بات سے غرض رہی ہے کہ رواں، سلیس عبارت میں صاف اور کھری بات کہہ دوں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب مصنف شعوری طور پر اسلوب کو اُف مدِنظر رکھتا ہے تو کیا اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خود اُسے بھی نقصان ہوگا اور پڑھنے والوں کو بھی [1]

اس اقتباس میں اس امر کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں کہ ادیب و شاعر کی تخلیقی آمادگی کی شدت خود اپنا اسلوب چن لیتی ہے، تخلیق کار کے ذوقِ جمال کے بعد اسے فن پارے کی تخلیق میں

---

[1] اسلوب: ۱۹۸۶ء۔ عابد علی عابد۔ ص: ۵۸۔

چاہے نظم میں ہو یا نثر میں کلیدی حیثیت حاصل ہے جیسے اُس میں مضمر سلاست روانی بے ساختگی سادگی اور فنی پختگی کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقی فن پارے کے اعلیٰ معیار کے لئے آمد ہی کا ہاتھ ہے نہ کہ آورد کا۔ ادبی اور غیر ادبی معیاری اور غیر معیاری اسلوب کے درمیان یوں ایک حدِ فاصل کھینچی جا سکتی ہے۔ دقیق اور گنجلک عبارات کو اسلوب کی معتبر انفرادیت کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ کسی تخلیق کار کے منفرد اسلوب کا مطالعہ روایات سے الگ کر کے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو جدتِ ادا اور اندازِ بیان کا حسن ہی ہے جو اُسے اپنے ہم عصروں یا کسی مخصوص شعبہ میں معروف شخصیات سے متمیز کر سکتا ہے۔ ہاں تو یہاں بھی انسانی وجود میں ودیعت صلاحیتوں کا صحیح موزون بھرپور اور متواتر اور اک استعمال ضروری ہے۔ یہی وہ شخصی فطری اور جبلی خصوصیت ہے جو شاعری میں انیس، دبیر، میر، غالب، داغ، اقبال، فیض اور نثر میں سرشار، محمد حسین آزاد، حالی، سرسید، ابو الکلام آزاد، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، واجدہ تبسم، قرۃ العین حیدر و دیگر ممتاز صاحب طرز شعراء و ادباء کو اپنا اپنا منفرد مقام، رنگ و آہنگ عطا کرتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں تسلسل و توسیع کے حوالہ سے باہم مربوط ہوتے ہوئے بھی ان میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ؎

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست ایں سعادت بزورِ بازو نیست

حافظ شیرازی نے انہی خیالات کو یوں باندھا ہے؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

علامہ اقبالؔ فن پارے کے حسنِ لازوال کے لئے ایسی غزل سرائی کے قائل ہیں کہ جو تلموں فطرت ہی پردۂ ساز بن جائے، ورنہ وہ غزل خوانی ہی کیا جو حسنِ فطرت سے صرف ہم آہنگ ہو اور اُس میں اپنے طور کوئی اضافہ ہی نہ کرے۔

؎ غزل آں گو کہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند

چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

غالب کے نزدیک اندازِ بیان ایسا ہو کہ دوسرے لوگ بھی ہمارے شاملِ حال ہوں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور پھر مکمل اظہار و ابلاغ بھی ناممکن اور اس کے نتیجے میں احساسِ حرماں بھی لازمی۔

بقولِ مولانا حالی ؎ کوئی محرم نہیں اپنا جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اب آئیے ذرا دیکھیں کہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے اُردو زبان کے افسانہ نگار، نثر پرداز اور محقق ڈاکٹر برج پریمی (وفات ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء) اپنی بات کہنے کا کونسا انداز اختیار کر گئے ہیں۔ پریمی اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

"میری ادبی زندگی کا سفر بیسویں صدی کے نصف میں کہانی کار کی حیثیت سے شروع ہوا اور کافی عرصہ تک میں اپنی روح کا درد اپنی کہانیوں میں انڈیلتا رہا اور اب بھی جب کسی داخلی کرب کی ٹیسیں اندر ہی اندر دور تک کاٹتی چلی جاتی ہیں تو کہانی جنم لیتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کہانی میرا پہلا عشق ہے۔"[1]

ہوش سنبھالا تو مختلف اصنافِ سخن سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چند قدم آگے بڑھائے تو صنفِ افسانہ سے جذباتی اور ذہنی رشتہ قائم ہوا۔ ٹیگور، پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ نگار برمانے[2] لگے لیکن اسی دوران سعادت حسن منٹو کے چند افسانے پڑھنے کو ملے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ شخص بات کہنے کا ایک نیا سلیقہ رکھتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کی پلاٹ

---

[1] حرفِ جستجو۔ ۱۹۸۲ء۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ پہلی بات: ص ۱۱
[2] یہاں 'بھرمانے' ہونا چاہیئے تھا۔

سازی، کردار نگاری کا فن، موضوعات کی انفرادیت، الفاظ کی بے حد کفایت کے ساتھ ترسیل و ابلاغ کی فنکاری اور کہانی کی بُنت کا ہنر مجھے بہت پسند آیا۔"[۱]

اور ہوا بھی یہی کہ منٹو برج پریمی کے لئے ادبیات کے مطالعہ کا سرچشمہ بن گئے۔ اور ان کا پہلا تحقیقی مقالہ "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" جس پر انہیں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی مفکرانہ مشفقانہ اور ناقدانہ نگرانی میں کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ابھی تک برج پریمی کی کہانیوں کا کوئی مجموعہ شایع نہیں ہوا ہے البتہ خود ان کی تحریر کے مطابق وہ بنیادی طور کہانی کار ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۹ء میں پہلی کہانی لکھی جب وہ ابھی صرف پندرہ برس کے تھے۔ لیکن باقاعدہ طور ۱۹۵۴ء سے کہانی لکھنا شروع کی۔ ریاست اور بیرون ریاست میں شایع ہونے والے مؤقر اخبارات وجرائد میں چھپتے رہے اور ایک کہانی کار کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی جملہ کہانیوں کی باضابطہ طباعت کی عدم موجودگی میں ان کی کہانیوں کے طرز تحریر کے بارے میں کچھ کہنا سراسر بے انصافی ہوگی۔ جب ان کے افسانے زیور طباعت سے آراستہ ہوں گے، تب دیکھا جائے گا۔ اس لئے میری یہ اجمالی اور حقیر کوشش ان کی دوسری مطبوعہ تنقیدی تحقیقی تجزیاتی اور تخلیقی تحریروں تک ہی محدود ہوگی، جن کی تفصیل یوں ہے۔

۱. سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ———— ۱۹۸۶ء
۲. حرفِ جستجو، تحقیق وتنقید ———— ۱۹۸۲ء
۳. جلوۂ صد رنگ " " ———— ۱۹۸۵ء
۴. ذوقِ نظر " " ———— ۱۹۸۷ء
۵. چند تحریریں " " ———— ۱۹۸۸ء
۶. کشمیر کے مضامین " " ———— ۱۹۸۹ء

برج پریمی کی ادبی زندگی کو سعادت حسن منٹو کی زندگی، شخصیت اور ادبی کارناموں پر

---

[۱] سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے۔ ۱۹۸۶ء۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ ابتدائیہ۔ ص: ۹۔

تحقیقی کام کرنے سے ایک کلیدی جہت ملی۔ اگر افسانہ برج پریمی کا پہلا عشق ہے تو منٹو پر کام کرنے
کی لگن، محنت اور ریاضت اس کی بے انتہا اور بے مثال توسیع ہے۔ برج پریمی نے اپنے تحقیقی
مطالعہ میں جابجا منٹو کی زندگی کی مختلف گتھیوں کو ایک پُرخلوص، غیر جانبدارانہ، ہمدرد اور غیر
متعصب ادب شناس کی حیثیت سے غیر مبہم، سلیس، سادہ، رواں اور مرغوب انداز بیان میں
سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ یہاں دور از کار تشبیہات و استعارات سے اپنے اخذ کردہ
نتائج کو مسجع اور مرصع نثر میں بیان کرتے تو وہ اپنے اصلی مقصد سے دور ہو جاتے اور اپنے چہیتے
موضوع سے بھی انصاف نہیں کر پاتے۔ برج پریمی کی آراء سے یا طرزِ استدلال سے اختلاف تو ہو سکتا
ہے لیکن اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ برج پریمی نے منٹو کی زندگی اور اس کے کارناموں
کو اکٹھا کر کے اجاگر کرنے کے لئے ایک سادہ و بے ساختہ موزوں تحقیقی و تنقیدی اندازِ بیان اختیار
کیا ہے۔ اُن کے اس کام کو اُردو ادبی حلقوں میں کافی سراہنا ہوئی۔ اُردو کے سربرآوردہ نقاد ڈاکٹر
شکیل الرحمن جو سالہا سال تک کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر رہے اور اسی حوالہ سے ڈاکٹر
برج پریمی کے قریب بھی، اُن کے اس سیر حاصل مقالہ کی سراہنا یوں کرتے ہیں:۔

"ڈاکٹر برج کشن ایمہ اور ادبی دنیا کے برج پریمی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی
پھر وہ کشمیر کی مختلف ادبی مجلسوں اور محفلوں میں ملے۔ ابتدا ہی سے مجھ پر اُن کی گہری
سنجیدگی اور ہر وقت کچھ جاننے اور سیکھنے کی لگن کا اثر ہوا تھا۔ ادبی محفلوں میں اُن کے
کئی افسانے بھی سن چکا ہوں، مختلف تخلیقات پر اُن کے تنقیدی تبصروں کو سن کر
یقین سا آگیا تھا کہ اگر انھوں نے ادبی تنقید کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی تو اُن کی
وساطت سے اُردو ادب کو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ ہوا وہی جس کا مجھے یقین تھا، سعادت
حسن منٹو پر اپنا سیر حاصل تحقیقی اور تنقیدی مقالہ لکھا، منٹو پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا تحقیقی
اور تنقیدی کارنامہ ہے جو اب شائع ہو رہا ہے۔ منٹو پر کام کرتے ہوئے وہ مجھ سے بہت
قریب رہے اور جانے کتنے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ اُن کا یہ کام بہت قیمتی

ہے۔ عرق ریزی، لگن محنت اور ریاضت سے منٹو کی شخصیت اور اُن کی تخلیقات کا ایک عمدہ تجزیاتی مطالعہ سامنے آتا ہے جس کی داد یقیناً انہیں ملتی رہے گی۔ منٹو نے اُنہیں اکسایا، اُن میں تحرک پیدا کیا۔ اور پھر فنون لطیفہ اور خصوصاً ادبیات کی جمالیاتی اقدار تک پہنچنے کا ذریعہ بن گئے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ ڈاکٹر برج پریمی کو میرے اس خیال سے اتفاق ہے یا نہیں لیکن تلاش وجستجو کے پورے سفر میں چونکہ وہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات بہت حد تک وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے منٹو کو موضوع نہ بنایا ہوتا تو ادبی فنی لسانی صوتی اقدار اور خصوصیات پر عام کاروباری نقادوں کی طرح عرصہ تک اُن کی نظر پھسلتی رہتی۔ منٹو نے انہیں ایک دلچسپ پُر اسرار اور بہت پیاری شخصیت دی جس سے انہوں نے ادب میں شخصیت اور فن یا شخصیت اور تخلیق کے پُر اسرار رشتے پر غور کرنا شروع کیا اور اسی طرح منٹو نے انہیں اپنا وہ آرٹ عطا کیا جس سے صرف مختصر افسانہ نہیں بلکہ فکشن کی رُوح تک رسائی پانے کے امکانات روشن ہوئے۔ ڈاکٹر برج پریمی چھوٹی بڑی اصطلاحوں سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اُن کی تنقید لفاظی پسند نہیں کرتی۔ وہ جملے باز نہیں دور کی کوڑی لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ بوجھل ترکیبوں میں ذہن کے سہارے مختصر اور آسان جملوں میں پیش کر دیتے ہیں اور یہی بڑی بات ہے۔[1]"

منٹو کی شخصیت بچپن میں کن نامساعد حالات میں پروان چڑھی۔ برج پریمی اُس کا سماجی اور نفسیاتی تجزیہ ایک مشفق نقاد کی طرح کرتے ہیں تاکہ منٹو کی نرالی ادائیں ہماری سمجھ میں آسکیں عبارت ملاحظہ ہو:۔

---

[1] حرف جستجو، ۱۹۸۳ء۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ پیش لفظ۔ شکیل الرحمٰن۔ ص: ۷-۸۔

"منٹو کی بے راہ روی ازلی تھی بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحوں تک انہوں نے ہر معاملہ میں غیر روایتی انداز نظر اختیار کیا اور اپنے لئے ایک الگ راہ بنائی۔ اُن کے بچپن کے حالات و واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں انہیں وہ شفقت اور پیار نہیں ملا جو شخصیت کی تعمیر میں خوشگوار اثرات کا حامل ہوتا۔ والد کی موت کے بعد عزیزوں اور قرابت داروں نے دشمنی برتی اور اُن کے حقوق غصب کئے جس کا نفسیاتی ردِ عمل یہ ہوا کہ منٹو ذہنی الجھنوں کے شکار رہے اور انہیں انسانی رشتے کھوکھلے دکھائی پڑنے لگے۔ یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ابتدائی زندگی سے ہی عجیب و غریب خلا کا احساس پریشان کرتا رہا جس کو پورا کرنے کے لئے لوگوں کی توجہ مختلف طریقوں سے اپنی جانب مبذول کرتے رہے۔ اس کا مثبت ردِ عمل اُن کی اپنی زندگی اور فکر و فن کی تقلید پرستی اور روایت پرستی سے گریز کی صورت میں رونما ہوا۔ انہوں نے جدت اور انفرادیت پسندی کو اظہار کا ذریعہ قرار دے کر اپنے غیر معمولی تخلیقی ذہن کا ثبوت فراہم کیا۔"[1]

ڈاکٹر حامدی کاشمیری جن کی معتبر اور سلیقہ مند نگرانی میں برج پریمی نے منٹو پر اپنا تحقیقی مطالعہ مکمل کیا یوں اپنی رائے پیش کرتے ہیں:-

"برج پریمی نے پرانے بوسیدہ تصورات ترک کر کے منٹو کی طوفانی زندگی اور اُن کے کارناموں کے بارے میں نئے اور اہم حقائق سامنے لائے ہیں انہوں نے تنقید کو تاریخی اور ساختیاتی انداز نظر کے امتزاج سے منٹو کی شخصیت اور اُن کے فن کا ایک بے تعصب مطالعہ پیش کیا ہے۔"

پروفیسر مسعود حسین خان برج پریمی کے اس مستحسن کام کی تہہ دل سے سراہنا کرتے ہوئے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:-

"واقعی آپ نے حالات و واقعات جمع کرنے میں بڑی کد و کاوش سے کام لیا ہے اور منٹو کے فن کا جائزہ نہایت ہی شگفتہ اسلوب نگارش میں پیش کیا ہے۔ ہر بات کو توقع

---

[1] سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے: ۱۹۸۶ء: ص: ۳۳-۳۴۔

سے زیادہ پایا۔"

'حرف جستجو' بھی اردو فکشن پر برج پریمی کے مضامین کا گلدستہ ہے جس میں روایتی انداز میں اردو کے صف اول کے کہانی کار پریم چند پر تین[3]، ریاست کے نامور کہانی کار پریم ناتھ پردیسی پر دو، منٹو پر چار مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں ان ممتاز کہانی کاروں کی شخصیات اور فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو افسانہ پر دو[2] اور مقالے بھی اس مجموعہ مضامین میں شامل ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی پر دو ایک مقالوں کی شمولیت قابل تحسین ہے کیونکہ مردہ پرستوں کی بستی میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو گرانقدر ادبی ورثہ زمانے کے دست برد سے محفوظ رکھتے ہیں۔ پردیسی ہی وہ پہلے کشمیری اردو کہانی کار ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے کشمیریوں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر ان کے دل کی دھڑکنوں کو ان میں بڑی فنی چابکدستی سے سمویا۔ برج پریمی، پردیسی کی کہانی پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے ان کے فنی ارتقا کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

"پردیسی کا یہ اسٹائل آہستہ آہستہ پریم چند کے اثرات سے الگ ہوتا جارہا ہے اور اس میں پہلے جو بوجھل اور بناوٹی انداز تھا وہ ختم ہوتا جارہا ہے۔"

پردیسی روایتی افسانہ نگار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے زمانے کا تقاضا تھا۔ اس لئے ان کے یہاں ابسٹریکٹ بیانات نہیں ملتے۔ بلکہ وہ پرانے افسانہ نگاروں کی طرح پلاٹ، مقصد اور دلچسپی کو گھول کر ایک اکائی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ ترقی پسند ضرور ہیں لیکن ان کے یہاں پروپگنڈہ اور صحافتی انداز نہیں ملتا۔ وہ اپنے کرداروں کے نفسیاتی عوامل کو نظرانداز نہیں کرتے اور ان کو اپنے معاشرتی پس منظر میں نہایت ہی خلوص کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں رنگارنگ کردار بھی ملتے ہیں اور ان کی معاشرتی پیچیدگیوں کے سیاق و سباق میں ان کا عمل اور رد عمل بھی۔"[1]

"جلوۂ صد رنگ" میں گو کہ اردو فکشن پر بہ شمول منٹو چار تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل کئے

---

[1] حرف جستجو۔ برج پریمی۔ ص: ۱۱۱۔

گئے ہیں لیکن مقالات کے اس گلدستہ میں نو مضامین کشمیر شناسی سے متعلق ہیں جو کہ کشمیر کی عظمت رفتہ کی تہذیبی بازیافت کے ضمن قابل صد ستائش کاوشوں کی حیثیت سے یاد کی جائے گی کشمیر غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں رہن سہن اور لباس آثار قدیمہ شہر لالہ وگل کلہن اور راج ترنگنی لل دید افسانہ یا حقیقت کشمیری لوک گیتوں کا سماجی پس منظر اور سر ارل سٹائین کے خطوط رام چند ربالی کے نام جیسے مضامین قابل ذکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اکثر مقالات کا طرز نگارش بھی موضوعات کے لحاظ سے مختلف ہوگا لیکن برج پریمی کا اندر کا کہانی کار انگڑائی لیتا ہے اور وہ رمزیت اور ایمائیت کا سہارا لے کر لفظی پیکروں میں اس انداز سے ہزاروں سال کی تاریخ کو صدا بند کر کے اس رنگا رنگ مجموعہ کی رونمائی کرتے ہیں کہ قاری صد رنگ جلوؤں کا نظارہ کرتا ہی رہے۔

● ”جہاں میں رہتا ہوں اسے صدیوں سے دھرتی کا سورگ کہا جاتا ہے۔ اپسراؤں کا یہ دیس تہذیب کی صبح سے اپنے ملکوتی حسن اپنے رنگ اور اپنے نور سے سورگ کے انسانی تصور کا پیکر ہے۔ یہ وہ خطۂ ارض ہے جہاں کے صد رنگ جلوؤں نے صدیوں سے سیلانیوں کو بھرمایا ہے۔ یہاں گیان وعرفان کے کتنے سوتے پھوٹے ہیں۔ آگہی اور بصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ اور عقل و عشق کے کتنے مرحلے انجام کو پہنچے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر یہ سب داستانیں منقش ہیں..........“[1]

● ”یہ سرزمین صدیوں کی غلام در غلام استحصال کی چکی میں پسی بے بسی کی نیندوں میں اونگھ رہی ہے۔ یہاں کے حسن کو بوالہوسی کی بھٹیوں میں خاکستر کیا گیا ہے۔ قدرت کے خزانے سے عطا ہوئی دولت کو جاگیر دارانہ نظام کے ہر دور میں بھر بھر کر لوٹا گیا۔ یہاں کے ذہن رسا، عقل و دل گیان و عرفان، علم و فن کو غلامی کی شمشیر نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ نسل در نسل غلامی کے حصاروں نے ذہنوں کو مفلس اور روح کو مقید کر کے بے بس و لاچار بنا دیا۔ یہاں کی معصوم اور بے ریا مہمان نوازیوں نے جاگیردارانہ اور جیک دارانہ نظام کے ناز و ادا کو سہہ لیا۔ یہ ماضی کے گھاؤ ہیں جو برسہا برس تک رستے رہے ہیں۔ جن کی یادیں اب بھی کبھی کبھی دل کے دریچوں میں لرزش پیدا کرتی ہیں اور سہمی سہمی نگاہیں بند ہو جاتی ہیں۔ لیکن بیداری اور چنگاری ہر عہد میں دہکتی رہی ہے۔“[2]

---

[1] [2] جلوۂ صد رنگ ۱۹۸۹ء، برج پریمی، یہاں میں رہتا ہوں، ص [illegible]

• "رام چندر ربالی ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۸ء تک تقریباً اکیس سال سر آرل سٹائین کے ساتھ رہے اور اُن کے ساتھ ہی برفانی، گھنے جنگلوں اور دُور دراز مقامات کی خاک چھانتے رہے۔ آرل سٹائین کی اس بامقصد آوارہ گردی میں رام چندر ربالی (ولادت ۱۸۸۹ء) کے علاوہ صرف اُن کا نوکر علیا ساتھ تھا جس نے اس قدر بھیانک مصائب کو جھیلا اور آثارِ قدیمہ کی چھان بین جستجو اور تلاش کر کے اِن بڑے کارناموں کی انجام وہی میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔"

• "رام چندر ربالی ایک عالم اور ماہر آثارِ قدیمہ نہ سہی لیکن کشمیر کے اس سچے عاشق (سر آرل سٹائین) کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے اُن کے کارناموں کی انجام دہی میں جو کام انھوں نے کیا وہ بذاتِ خود ایک کارنامے سے کیا کم ہے۔ آج رام چندر ربالی کو کوئی نہیں جانتا جن کے بارے میں سر سٹائین نے ایک بار لکھا تھا:۔ ———

"اس طویل عرصے میں جب وہ تن تنہا بڑے ہی مشکل اوقات میں میری مدد کرتے رہے میں نے انہیں ذہین، قابلِ اعتماد اور زبردست مددگار پایا۔"[۱]

یہ بالآخر رام چندر ربالی ہی تھے جن کے ہاتھوں ۱۹۴۳ء میں کابل میں وفات پانے کے بعد سر آرل سٹائین کی خواہش کے احترام میں کہ انہیں موہند مرگ میں دفن کیا جائے ایک چٹان پر کتبہ کندہ کرایا گیا جس کی عبارت یہ ہے۔

"سر آرل سٹائین نے ۱۸۹۵ء کے موسم گرما جب کہ وہ راج ترنگنی کی تالیف کر رہے تھے۔ اس مرگ میں پہلی بار کیمپ لگایا۔ بعد ازاں جب وہ اپنے سفر ہائے عظیم کا حال لکھ رہے تھے کئی بار موسم گرما میں پھر یہاں آئے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہاں سے افغانستان روانہ ہوئے۔ اکاسی سال کی عمر میں بمقام کابل ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو رحلت کر گئے۔"[۲]

آرل سٹائین کے خطوط رام چندر ربالی کے نام ہی "جلوۂ صد رنگ" میں شامل پریمی کا نہایت ہی اہم

۱۔ جلوۂ صد رنگ۔ برج پریمی۔ آرل سٹائین کے خطوط رام چندر ربالی کے نام ص ۲۵۰۔

۲۔ جلوۂ صد رنگ۔ برج پریمی۔ آرل سٹائین کے خطوط رام چندر ربالی کے نام۔ ص: ۲۳۹-۲۵۲:

مضمون بھی ہے اور انکشاف بھی جو اس عظیم تہذیب شناس کی دلربا شخصیت اور کشمیریوں کی ذہانت کی ایک انوکھی اور فکر انگیز جہت سے پردہ اٹھاتا ہے محمد یوسف ٹینگ جلوۂ صد رنگ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ اس عظیم غاور شناس اور کشمیر نواز کی زندگی کا ایک نرالا زاویۂ نگاہ ہو کے سامنے لاتا ہے۔ اُس کی شاندار علمی اور تحقیقاتی مہمات سے ہم سب واقف ہیں۔ اپنی علمی پرواز میں کبھی کبھی اُس کی رفتار اتنی تیز اور اُونچی ہو جاتی ہے۔ اُس کی انسانی حیثیت کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ رام چندر ریالی کے نام خطوط میں وہ ایک دلنواز اور درد مند انسان کی حیثیت سے نظر آتا ہے اور یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کشمیر سے اُس کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ افسوس ہے کہ حالات نے کشمیر میں دفن ہونے کی اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دی۔۔۔۔ پریمی کا انداز بیان دلکش ہے اور اس نے کشمیر کی تواریخ کے ہزارہا صفحات کو چھان کر چند کیپسول (CAPSULE) قسم کی معلومات اس طرح اُبھاری ہیں کہ کشمیر اور اس کے لوگوں کے تواریخی اور تمدنی سفر کے نت نئے گوشے روشن ہو جاتے ہیں"۔[۱]

جہاں جلوۂ صد رنگ کے مضامین ہمیں اپنے تہذیبی ورثہ کو سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں وہاں 'ذوق نظر' کے انشائیے اور ادبی مضامین کشمیر میں اُردو ادب شناسی تحقیق اور تنقید کی تفہیم کے ضمن میں ایک سنجیدہ کوشش ہے جیسا کہ مقالوں اور انشائیوں کے عنوانات ہی سے عیاں ہے کہ برج پریمی کے دل میں کشمیر کے اُردو ادبی ورثہ کو محفوظ رکھنے اور پرکھنے کی بے انتہا لگن ہے۔ پریم ناتھ سادھو (پردیسی) ہو یا منٹو، پروفیسر نند لال طالب ہو یا پروفیسر عبدالقادر سروری اُردو کہانی کے بدلتے رنگ ہوں یا کشمیر میں اُردو تنقید سب کا بالواسطہ اور بلاواسطہ کشمیر اور یہاں کی ثقافتی اور ادبی تحریکوں سے گہرا رشتہ ہے جو پریمی کی پر خلوص قلمی کاوشوں سے زیادہ نمایاں اور مضبوط تر ہو گیا ہے 'ذوق نظر'

۱۔ جلوۂ صد رنگ۔ برج پریمی۔ پیش گفتار از محمد یوسف ٹینگ۔ ص: ۱۳-۱۴

کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پریمی کا اسلوبِ نگارش اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا اور نکھرا نکھرا منجھا منجھا اور سلجھا سلجھا سا ہے جو ان کی مسلسل ریاضت، مشق اور لگن کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر نند لال کول طالب اور سروری کے سوانحی خاکے پریمی کے داخلی رنگ میں رنگ کر تیکھے اور پر اثر لگتے ہیں۔ ان جیسی دوسری تحریرات میں بھی ایک خوش گوار بے ساختہ پن ہے جو قبول عام کی سند بھی ثابت ہو سکتا ہے دو ایک نمونے حاضر ہیں:۔

"آج کبھی کبھی بے خیالی میں جواہر نگر (سرینگر کشمیر) سے گزرتے ہوئے ۴۶ نمبر کے سرکاری کوارٹر کے سامنے میرے پاؤں رک جاتے ہیں۔ کوئی آسیب ہے کہ سڑک پر کھلنے والے دروازے کے باہر میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتا ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی دروازہ کھل جائے گا اور سنہری چشمے کے فریم کے اندر سے جھانکتی ہوئی دو آنکھیں میری آنکھوں کے اندر جھانکنے لگیں اور کہیں گی۔"

"آیئے ایمہ صاحب آپ کا ہی انتظار تھا۔" (عبد القادر سروری۔ ص: ۱۲۲)

"ماضی کی وادیوں میں جھانکتا ہوں تو دوڑتا بھاگتا بچپن سامنے آجاتا ہے۔ والد میری انگلی پکڑ کر ان جانی دنیاؤں کی سیاحت کرواتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہمک ہمک کر اچھلنے لگتا ہوں۔ ملں کے چرخے کا چکر گھم گھم کر کے اچانک رک جاتا ہے۔ وہ اپنی مدھ بھری مسکان کا مالہ میرے ارد گرد تان لیتی ہیں اور میری شوخیوں کے انار چھوٹ کر فضا میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔

حبہ کدل درابی یار میں ایموں کا گنجان محلہ تنگ و تاریک گلی کے اندر ٹوٹا پھوٹا مکان۔ اس کے ایک کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر میرے والد پھرن کی آستین پر تھیمے کا ایک "کھوسہ" تھامے محلے والوں پر رعب جھاڑ رہے ہیں اور جرمن وار کے قصے سنا رہے ہیں۔ ظاہر ہے دوسری جنگ عظیم کا زمانہ ہے۔ بڑے سے بے دیوار کے مشترکہ آنگن میں پاس پڑوس کے مکانوں کی کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے ڈھیر بغور جرمنی

کی آبرو ریز کشتیوں کے کارنامے سن رہے ہیں۔ عورتیں خوفزدہ ہیں اور مردوں پر جیسے آسیب منڈلا رہے ہیں۔

"شام جی!"

اچانک پاس کی گلی سے ایک بھاری بھرکم آواز لہراتی ہے۔

والد خاموش ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ والد بھی نظریں پھیر لیتے ہیں۔

نمسکار۔۔۔۔آئیے۔

اور والد کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر تھرتھراتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ والد کھڑے ہو کر نو وارد کا استقبال کرتے ہیں۔ نو وارد بڑی عزت سے والدہ کو پرنام کرتے ہیں جو فوراً اپنا چرخا ہٹا کر چائے پانی کا اہتمام کرنے باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں۔ انگریزی سوٹ میں لپٹے لپٹائے یہ دھان پان سے آدمی سر پر ایک خوش وضع پگڑی باندھے بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے اپنی گود میں بٹھا دیتے ہیں اور گالوں پر دو بوسے ثبت کرتے ہیں۔ میں گالوں پر داڑھی کی کھرچن محسوس کر کے بھاگ جاتا ہوں۔ والد چلم سلگاتے ہیں اور نو وارد حقے کے بڑے بڑے کش کھینچ کر سارے کمرے میں سرمئی غبار بھر دیتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کچھ لکھنے پڑھنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ نو وارد دکھ پکا رہے ہیں۔ اس درمیان والد کے کئی اور دوست آجاتے ہیں۔ ماں سماوار میں خوشبودار قہوہ لا لا کر مہمانوں کی تواضع کرتی ہیں۔ بڑی دلنواز محفل ہے۔ میں کمرے کے ایک کونے میں تختی لکھنے کا سوانگ بھر رہا ہوں۔

پنڈت نند لال کول طالب سے یہ میری پہلی بھینٹ ہے۔

رات کو میرے پوچھنے پر والد بتاتے ہیں "یہی میرے دوست نند لال ہیں۔ نند لال طالب" ____ (اقتباس از: نند لال کول طالب کاشمیری: ص ۴۴-۱۴۳)

ایسے بولتے دریچے کھول کر برج پریمی فنی چابکدستی سے ہمیں وطن مالوف کشمیر کی تہذیبی زندگی کی یاد دلاتے بے تکلف اور سادہ عبارت میں دلا کر ہمارے زخموں کو تازہ کرتے ہیں۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کشمیریوں کی پچاس ساٹھ سال پہلے کی مدنی زندگی کی بولتی تصویر ہماری

آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔

برج پریمی کے ادبی مضامین اور انشائیوں کا گلدستہ چند تحریریں بجا طور ان کے اسلوب نگارش کے فنی ارتقاء کا غماز ہے۔ برج پریمی کے اس مجموعے میں شامل کاوشوں سے اس بات کی صریح غمازی ہوتی ہے کہ ان کے گوشت پوست کے وجود میں انتہائی حساس کہانی کار انشا پرداز چھپا ہوا ہے جو مختلف صورتوں میں ابھر ابھر کر ہمارے سامنے رقصاں نظر آتا ہے۔ تحقیق و تنقید ہے یا سفر نامے اور انشائیے، دیومالائی کتھا کہانیاں ہوں یا فلمی اور ثقافتی شخصیات خواجہ احمد عباس ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور اوپیندر ناتھ اشک کی فلمی ادبی کو دین کا جائزہ، اکبر جے پوری کی شعری دنیا ہو یا منٹو کی فنا توی کائنات، پریم ناتھ بزاز ہو یا کلدیپ رعنا، پریمی کا فن نکھرتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اختصار و ایجاز ہی اس مجموعے کی خصوصیت ہے۔ پریمی نے مضامین کے انتخاب میں عجلت اور بے جا فراخدلی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ فوری جذباتی ردِ عمل کے طور لکھی گئی نثری مراثی کے شامل کئے جانے سے تحریروں کے اس گلدستے کے پھولوں کے رنگ پھیکے پڑے ہیں۔ بہتر یہ ہوتا کہ انہیں اس میں شامل ہی نہیں کیا جاتا۔ بمبئی سے بمبئی تک (سفر نامہ) میں پریمی کی ذات پورے آب و تاب کے ساتھ تھرکتی مچلتی دکھائی دے رہی ہے۔ اسے بلا کسی جھجک کے انشائیوں کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ روانی، شگفتگی اور بے ساختگی اس کی جان ہے طرزِ نگارش اتنا دلکش ہے کہ جیسے ہم بھی پریمی کے ساتھ محوِ سفر ہیں پچاس طلبا کے چھوٹے مگر جوان اور طوفان خیز اور حیات افروز قافلہ کی معیت میں۔ آئیے ذرا ہم بھی چند لمحات کے لئے کونکن کے ساتھ ہو لیں:-

"کونکن شکتی" اس اسٹیمر کا نام ہے۔ یہ مغل لائن والوں کا اسٹیمر ہے جس میں ہم سفر کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ پچاس طلبا کا قافلہ ہے۔ کونکن اس علاقہ کا نام ہے جہاں کونکنی بولی جاتی ہے مراٹھی سے ملتی جلتی یہ بولی تحریر میں نہیں لائی جاتی ہے[1] یہی بولی عام طور سے گوا میں بولی جاتی ہے۔ کونکن شکتی

---

[1] کونکنی باضابطہ علاقائی زبان کی حیثیت سے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے بھی تسلیم کی جا چکی ہے اور اس زبان میں لکھی گئی کتابوں پر انعامات بھی دیا کرتی ہے۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ اس کا حلقہ تحریر بولے جانے والے حلقہ سے بہت تنگ ہے۔

کے معنی ہیں کونکن کی طاقت۔ یہ اسٹیمر نیری دارف اور گوا کی راجدھانی پناجی کو ملاتا ہے۔

ہمارا جہاز ۲۷ جنوری ۱۹۸۰ء ٹھیک دس بجکر دس منٹ صبح پانی میں ہلنے لگتا ہے۔ کونکن شکتی پر ڈیڑھ ہزار مسافروں کو سمونے کی جگہ ہے۔ چار منزلوں کا یہ چھوٹا جہاز بڑا مضبوط جہاز ہے۔ سب سے اُوپر والی منزل صاف شفاف ہے جس کے فرش اور دیواروں پر سبز پینٹ لگا ہوا ہے۔ اس حصّے میں چھوٹی بڑی مشینیں اور آلات نصب ہیں۔ آخری سرے پر کپتان اور جہاز کا عملہ ہے۔ کپتان مسٹر مکرجی ایک بنگالی نوجوان ہیں۔ بحری ہیٹ، قمیص اور نکر پہنے ہوئے وہ کپتان سے زیادہ ٹینس کے کھلاڑی لگتے ہیں۔ اُن کے مُنہ میں پان کی گلوری ہے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ انتہائی تپاک سے ملے۔ ہماری گذارش پر بحری جہاز کا مشینی نظام سمجھا رہے ہیں۔ عرض بلد، طول بلد کے نقشے، ستاروں اور سیاروں کے زاویے، کمپاس اور سمت کے سوالات، رفتار اور لہروں کے مسائل، طوفانوں کے مقابلے، بیسوں پیچیدگیاں ہم نے اُن کے سامنے رکھیں، وہ بڑی محبت سے جواب دے رہے ہیں۔ کپتان صاحب ملکی سیاست سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کانگریس اور جنتا پارٹی کی سیاست، ایمرجنسی کا نفاذ، جمہوریت اور آمریت ان سبھی مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ہم نے انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ خوش ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن کا سارا موڈ آف ہو گیا جب ہمارے ایک برخوردار نے اُن کے انکار کے باوجود کمرے میں داخل ہونے پر اصرار کیا۔"

(بمبئی سے بمبئی تک ص ۷۶ - ۷۵)

"کشمیر کے مضامین" جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کشمیر کی ثقافت، تاریخ، شخصیات اور ادب سے متعلق تنقیدی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جو برج پریمی کی کشمیر شناسی کا غماز ہے اور تہذیبی بازیافت کے سلسلے میں اُن کی قابل صد ستائش کاوش بھی۔ پریمی اپنی محبوب جنم بھومی کشمیر کے حسن یکتا کو کئی زاویوں سے دیکھنے کی مستحسن کوشش کرتے ہیں کیونکہ عظمت رفتہ کا سراغ لگائے بغیر ہم آئندہ اپنی قومی زندگی کے خوابوں کا محل تعمیر نہیں کر سکتے۔ کشمیریات کے حوالے سے اگر ایک طرف کشمیر کے فن تعمیر، آثار قدیمہ اور تاریخ پر تحقیق و تجسس کر کے خامہ فرسائی کی گئی ہے تو دوسری طرف کشمیری اور اُردو شعر و ادب سے بالواسطہ اور بلاواسطہ وابستہ شخصیات کی حیات اور کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے تاکہ وہ اُن کے ساتھ ساتھ کشمیر کی

ثقافت اور صحافت کے نقوش کو اپنے طور محفوظ کر سکیں۔ وہ گوپی ناتھ کول ہو یا پروفیسر سروری، منٹو ہو یا حامدی کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی ہو یا پریم ناتھ دھر، لل دید ہو یا مہجور، بر تیر ہو یا آرل سٹائین سبھی کشمیر کی انفرادی تہذیبی شناخت کے واضح خدوخال ہیں جنہیں الفاظ کا جامہ پہنا کر پریمی نے کشمیر سے عشق کے تصور کو لازوال بنانے کی ادھوری ہی سہی کوشش تو یوں کی ہے:

"یہ کیسی مٹی ہے جو اس قدر مشکبار ہے۔ یہ کیسی جگہ ہے جس کے نیلے امبر میں من موہنے کا طلسم ہے۔ یہ کیسی سرزمین ہے جس کی صبحوں اور شاموں میں روحانی اسرار ہیں۔ یہ کیسی وادی ہے کہ جس کے جنگلوں کے سناٹوں میں اپسراؤں کے نغموں کی گنگناہٹ ہے۔ یہ کیسی فضائیں ہیں کہ جن کی ہواؤں میں سورگ کا آنند ہے اور جس کے پربتوں میں حسن کی شراب برستی ہے ہم اس راز کو کیا جانیں![1]

بقول علامہ اقبالؒ یہ جانتے ہوئے

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

برج پریمی کے قلم میں روانی ہے۔ اُن کی تحریریں پڑھ کر زبان کی گرانباری یا ثقالت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ دل کو موہ لینے والی سادگی، ملائمت اور شائستگی کا احساس ہوتا ہے۔[2]

اُن کی اُردو زبان و ادب سے گہری علم و آگہی الکتابی ہوتے ہوئے بھی فکر انگیز ہے۔

افسوس کہ کشمیری اُفق کا یہ اُبھرتا ہوا ستارہ پورے آب و تاب کے ساتھ آسمان ادب پر چمک نہ سکا اور وہ نامساعد حالات میں ذیابیطس کے موذی مرض میں مبتلا وطن مالوف کشمیر کی یاد کی

---

[1] کشمیر کے مضامین۔ برج پریمی۔ بر تیر اور کشمیر۔ ص: ۴۸

[2] کشمیر کے مضامین۔ برج پریمی۔ پیش لفظ: از ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ص۔ ۱۳

آگ میں جل کر ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو جموں میں بے وقت فضائے بسیط میں تحلیل ہوئے۔ وہ ذہنی لحاظ سے شباب کو پہنچ تو چکے تھے لیکن اپنے دیرپا، دلربا اور جانفزا رنگوں سے نکھار کر اسے اور زیادہ سدابہار نہ بنا سکے۔ دیکھا جائے تو انسان کا مقدر یہی ہے کہ ؎

سو بار تیرا دامن ہاتھوں میں میرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

(اصغر گونڈوی)

نشاط انصاری

ایک شعلۂ مستعجل

وادیٔ گلزنگ کے خوش پوش اور خوش گفتار، خوش وضع اور خوش اطوار منجھے ہوئے کہانی کار، محقق اور ذہنِ انتقاد رکھنے والے ڈاکٹر برج پریمی (برج کشن ایمہ) کے ساتھ جب آج سے تیس تبیس برس قبل میری پہلی ملاقات شہر سرینگر کے کالج آف ایجوکیشن کے بہار آفرین لان میں ہوئی جہاں وہ بیچلر آف ایجوکیشن کی پیشہ ورانہ تربیت پا رہے تھے تو دورانِ گفتگو درمیانہ قد کے اس سجیلے کشمیری نژاد پنڈت نوجوان کی قلمی اٹھان دیکھ کر مجھے لگا کہ اُن کی ادبی اور فکری صلاحیتوں کے سورج کی کرنوں نے اپنا نور بکھیرنا شروع کر دیا ہے۔ برج پریمی کی اردو نوازی اور خاص طور سے اُن کے رس دار اندازِ بیان، نپے تُلے لفظوں اور حُسنِ اخلاق نے مجھ پر کشش انابیب شعری کی مستحکم کمند ڈال کر مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا اور ذوقِ نظر سے مملو ڈاکٹر برج پریمی نے مجھے اپنی پہلی ہی ملاقات میں محبت کی مالا کے اندر پرو کے رکھ دیا۔

کالج آف ایجوکیشن سے تربیت پانے کے بعد پریمی لبا اوقات مجھ سے ادبی مجلسوں سمیناروں اور سرینگر کے سول لائینز میں جب کبھی ملتے، ہماری باہمی گفتگو، بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیالات

کا مرکز اُردو زبان و ادب اور شاعری کے اساتذہ سخن کا کلام اور اُن کی گراں قدر تصنیفات دواوین اور اُن کے ادبی کارناموں تک ہی محدود رہتا۔ اُن کی ابتدائی ملاقاتوں کے چند برس کے بعد ہی برج پریمی جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کی ڈگری لے چکے اور بعد ازاں اپنی قابلیت کی بنا پر کشمیر کی دانش گاہ کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوئے۔ وہاں کچھ مدت کے بعد انھوں نے دُنیائے اُردو کے ایک کامیاب ناول نگار، جرنلسٹ، نارون مزاج افسانہ نویس اور صنفِ نازک کے دہکتے ہوئے گالوں کی آگ پر اپنی محبت کے سرد توسٹ سینک لینے والے سعادت حسن منٹو کی حیات اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی ذمہ داری قبول کر چکے اور اپنی محنت اور فنی و فکری کوششوں سے منٹو پر ایک معرکتہ آرا تھیسز لکھ کر ادبی دُنیا میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دے گئے۔

سعادت حسن منٹو پر تحقیقی مقالہ لکھنے اور اُن کے ادبی کارناموں کی کھوج اور بازیافت سے متاثر ہو کر پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مسعود حسین خان، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، کشمیری لال ذاکر اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری جیسے نامور نقاد اور چوٹی کے ادیب اور اہلِ بصیرت نے ڈاکٹر برج پریمی کی کدو کاوش کی پذیرائی کرتے ہوئے اُن کو ادبی دُنیا کے محققین کی صف میں مناسب جگہ دے دی ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی وادی بہاراں کے بہت ہی سنجیدہ اور ایک خاموش صاحب قلم تھے۔ اُن کو جہاں اپنے معلمانہ پیشہ کے ساتھ گہری وابستگی تھی وہاں اُن کو فن ادب، ثقافت، ہندوستانی فلم اور آرٹ کے کئی ایک شعبوں کے ساتھ شیفتگی کی حد تک دلچسپی بھی تھی۔ پریمی جس کسی عنوان کو لے کر اُس پر کام کرنے لگ جاتے اپنی دروں بینی اور فنِ نقد کی صلاحیتوں کے ساتھ اُن سے پورا پورا انصاف برت لیتے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے سعادت حسن منٹو پر بہت کچھ لکھنے کے علاوہ کشمیر کی صاحبِ عرفاں شاعرہ للہ ایشوری، وادی کے پہلے مورخ کلہن پنڈت، پیر پنڈت پادشاہ، نند لال کول طالب، پریم ناتھ پردیسی، پروفیسر عبدالقادر سروری، راجندر سنگھ بیدی، سردار جعفری، سر آرل سٹائین وغیرہ شخصیتوں پر تحقیقی اور ناقدانہ مقالات لکھنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی ثقافت، ادب، فنِ تعمیر اور یہاں کی سماجی و تہذیبی زندگی کے کئی پہلو اجاگر

کرائے ہیں۔

گزشتہ تین دہوں کے دوران اس شعلہ مستعجل نے سعادت حسن منٹو کے کارناموں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے سے قطع نظر چند تحریریں ریاست جموں و کشمیر میں اردو فکشن، حرف جستجو، ذوق نظر اور جلوۂ صد رنگ جیسی گراں پایہ تصنیفات منظر عام پر لاکر بساط ادب پر اپنا مقام بنایا۔ چنانچہ مغربی بنگال کی اردو اکادمی نے برج پریمی کے تحقیقی مقالہ منٹو۔ حیات اور کارنامے پر انہیں اکادمی ایوارڈ دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اہتمام سے بازیافت نام کا جو تحقیقی و تنقیدی مجلہ سال میں دو بار شائع کیا جارہا ہے اس کی مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے ڈاکٹر برج پریمی نے جن ذمہ داریوں کو جس خوبی نبھایا ہے وہ قابل ستائش ہیں کچھ مدت تک برج پریمی سٹیٹ ریسورس سنٹر کشمیر یونیورسٹی کے ناظم کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دے چکے۔

ریاست کی دانش گاہ میں جاکر جن انتقادی اور تحقیقی و ادبی خدمات کی روشنیوں کے پھیلاؤ میں یونیورسٹی کا شعبۂ اردو و ڈاکٹر برج پریمی کے قلم ذہن و ذکاوت اور فکر و فن سے مرافعہ پذیر تھا، ان کی ادائیگی میں وادی کا یہ شعلۂ مستعجل کم سے کم وقت میں اسی طرح عہدہ برآ ہوا جس طرح کہ شب تاریں ایک کوندتا ہوا شعلہ اپنے چاروں طرف چکاچوند پیدا کرکے نہایت عجلت کے ساتھ بیابان عدم کی بے پناہ وسعتوں میں دیکھتے ہی دیکھتے کھو جاتا ہے۔

دراہی یار (حبہ کدل) سرینگر کے ملگجی ماحول میں جنما ہوا یہ نامور ادیب افسانہ نگار اور محقق اپنی پچپن ۵۵ سالہ حیات کے دوران اپنی ژرف بینی اور کد و کاوش سے اردو نثر کی ژولیدہ زلفوں کو سنوارتے سنوارتے اس وادیٔ رنگاراں میں انہونی سیاسی بے چینی کی ناخوشگواریت سے خائف ہوکر پیوستہ سال غریب الوطنی میں اپنے محققانہ مشن کو پورا کرتے ہوئے اس بساط حیات سے اٹھ کر دور بہت دور آسمان کے ساتھ سرگوشیاں کرنے والے ان پہاڑوں کی اوٹ میں چلے گئے جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں لوٹا ہے مرزا غالب کے اس شعر کی روشنی میں وادیٔ کشمیر کے اس شعلۂ مستعجل نے دکھا دیا کہ زمانہ حیات کی مدح رقص شرر سے زیادہ نہیں ہوتی ؎

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

پتمبر ناتھ دَرفانی کاشمیری

کچھ یادیں کچھ تصویریں

یقین نہیں آتا کہ ڈاکٹر برج پریمی آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اس بات کا وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ مادرِ کشمیر کے سایۂ عاطفت سے دور رہ کر جموں کے مہاراجہ گلاب سنگھ ہسپتال میں چند گھنٹوں کی علالت کے بعد برج پریمی پچپن سال ہی کی عمر میں قبل از وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہیں گے اور ادبی دنیا میں ایک خلا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میانہ قد، فربہ بدن، گورا گورا گول چہرہ، ابھری ابھری چمکیلی آنکھیں، صاف و شفاف لباس زیبِ تن، گٹھا ہوا ذہن۔ یہ تھی پہچان اُس ادیب، محقق اور نقاد کی جو برج کشن ایمہ سے برج پریمی اور برج پریمی سے ڈاکٹر برج پریمی ہو گئے۔

برج پریمی سے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار میری جان پہچان ہوئی۔ اُس سال ہم دونوں مولانا آزاد روڈ (سرینگر) کی جلو میں واقع ٹیچرس ٹریننگ کالج میں (جو کہ اب گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کہلاتا ہے) بی۔ ایڈ (بیچلر آف ایجوکیشن) کی تربیت پا رہے تھے۔ عمر کے لحاظ سے ہم دونوں میں کئی سال کا فرق تھا۔ اُن دنوں برج پریمی ایک خوبرو جوان مرد تھے، جب کہ میں چالیس سال کی عمر کا ایک ادھیڑ آدمی تھا۔
۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں برج پریمی اور میں نے جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کے پرائیویٹ

اور فائینل امتحانات بالترتیب ایک ساتھ اعزاز کے ساتھ پاس کئے۔ ہمارے ساتھ بی۔ ایڈ کی ٹریننگ پانے والے جو چند اور استاد ایم۔اے (اُردو) کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اُن میں قطب الدین ماہر الطاف حسین اور جانکی ناتھ بُدکی قابلِ ذکر ہیں۔ قطب الدین ماہر ہماری طرح پہلے درجے میں جب کہ الطاف حسین اور بُدکی تیسرے درجے میں کامیاب ہوئے۔

بدورانِ تربیت برج پریمی ایک کم گو اور متین استاد طالب علم نظر آتے تھے اور ہمیشہ محوِ مطالعہ رہتے تھے۔ ٹریننگ کالج کے غیر از نصاب مشغلوں اور کھیلوں میں ضرور حصہ لیتے تھے لیکن مناظروں مباحثوں اور ڈراموں سے دُور ہی رہا کرتے تھے۔ دراصل وہ اپنے ذہن کو ذوقِ مطالعہ کی سان پر تیز سے تیز تر کرنے کو پہلی ترجیح دینا اور کچھ سے کچھ بننا چاہتے تھے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے اس شعر کا مصداق بننے کے متمنی تھے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ایم۔اے (اُردو) کا امتحان پاس کرنے کے شوق و انہماک میں اور ازاں بعد تاریخی تحقیق و تفتیش کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اسی دوران میں سرینگر کے کچھ اُردو اخباروں میں شائع شدہ ان کی چند ایک افسانے میری نظر سے گزرے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ برج پریمی مستقبل قریب میں ایک اچھے ادیب بننے والے ہیں۔ چنانچہ اس بات کی تصدیق نہ صرف ان کی کہانیوں ہی سے بلکہ اس کتاب سے ہوئی جو کہ جلوۂ صد رنگ کے عنوان سے معنون منظرِ عام پر آگئی۔ یہ کتاب اُن مقالات پر مشتمل ہے جو برج پریمی نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے اور جس کا تعلق کشمیر کے آثار الصنادید تاریخی مناظر و معابد، بزرگ درویشوں، عارفوں، ریشی منیوں، ادیبوں اور صحافیوں وغیرہ سے ہے۔ یہ مقالات برج پریمی کے سالہا سال کے وسیع مطالعہ اور تحقیق و تجسس کی پیداوار اور آئینہ دار ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے۔ برج پریمی کچھ سے کچھ بننا چاہتے تھے۔ ذرہ سے شرر، شرر سے ستارہ اور ستارہ سے آفتاب بننے کی تمنا ان کے حوصلوں اور ولولوں کو ہر وقت گدگداتی اور تڑپاتی تھی جیسے کہ شاعرِ مشرق سر ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا یہ شعر ان کے سیمابی جذبات اور بے قرار دل کو

مرتعش اور اُن کے اشہبِ قلم کو مہمیز عطا کر رہا ہو:۔

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

برج پریمی ایک دلنواز شخصیت کے مالک تھے محنت شاقہ اُن کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی ایم۔اے (اُردو) کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے اُردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے سربراہ وقت پروفیسر عبدالقادر سروری کی رشد و ہدایت میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا لیکن شومیٔ قسمت پروفیسر سروری ۱۱/۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی رات کو سرینگر میں اچانک حرکتِ قلب رُک جانے کے نتیجے میں رحلت کر گئے اور برج پریمی کو گریاں و بریاں چھوڑ گئے۔

سروری صاحب کے ارتحال پُر ملال کے چند یوم بعد مجھے برج پریمی کی طرف سے ایک چھٹی موصول ہوئی جس کو من و عن ذیل میں درج کرنا شاید بے محل اور بار خاطر نہ ہوگا۔

محترم فانی صاحب!

آداب!

سروری صاحب چلے گئے اور اُن کے ساتھ ہی ایک دور ختم ہو گیا۔

میں ابھی چند دن ہوئے اُن کے ہاں بیٹھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی چیزوں کی تلاش میں وہاں آ رہے تھے۔ میں نے بھی کاغذات کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا تو کسی نندلال صاحب ناشاد کی بیاض ملی۔ اُن کے بارے میں سروری صاحب کے متعلقین کو کوئی واقفیت نہیں۔ اگر آپ ناشاد صاحب کو جانتے ہوں تو آپ اُن کو مطلع کر دیجئے گا نہیں تو وہ بیاض ضائع ہو جائے گی۔ میں نے اس سلسلے میں شری جیالال برق سے بھی بات کی تھی۔ اور کیا کہوں؟

خلوص کیش
'برج پریمی'

جناب پیتامبر ناتھ فانی صاحب
بی۔ٹی۔ سکول سرینگر

یہ نے برج پریمی کی چھٹی ملتے ہی سروری صاحب کی کوٹھی پر جا کر مذکورہ بیاض حاصل کی۔ اور درابی یار (سرینگر) میں رہنے والے ناشاد صاحب کے متعلقین کے حوالے کی۔

پروفیسر سروری کی رحلت کے بعد برج پریمی نے اپنی ٹوٹی ہوئی کمر ہمت کو پھر سنبھالا دیا۔ اور اردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کر کے ہی دم لیا جس کی بدولت وہ ایک جست میں ایک سکول ماسٹر کے عہدے سے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اُستاد کے درجے پر جا پہنچے۔ کشمیر یونیورسٹی سے منسلک ہوتے ہی برج پریمی کے اشہبِ قلم نے اور جولانیاں دکھانا شروع کیں۔ انھوں نے کئی سال کی عرق افشانی اور دیدہ ریزی کے بعد باغی ادیب سعادت حسن منٹو کی زندگی کے حالات اور ادبی کارنامے ایک قابلِ قدر کتاب کی صورت میں یکجا کر کے منصۂ شہود پر لائے۔ اس کتاب کی ہر جگہ بڑی تشہیر ہوئی ہے اور مصنف کو بعض اردو اکاڈمیوں کے ایوارڈ بھی عطا ہوئے ہیں۔

بایں ہمہ برج پریمی کی ایک تمنا تشنۂ تکمیل رہی ہے۔ وہ ایک اور یادگاری کتاب تصنیف کرنا چاہتے تھے جس میں اُن کارناموں کا ذکر کیا جاتا جو کشمیری پنڈتوں نے علم و ادب، تاریخ، صحافت، فنونِ لطیفہ وغیرہ کے الگ الگ میدانوں میں انجام دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ضروری مواد بھی اکٹھا کرنا شروع کیا تھا جو اُن کے فرزند ارجمند اور ہونہار ادیب پریمی رومانی کے پاس شاید محفوظ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ "آں کہ پدر نتواں کرد پسر تمام خواہد کرد۔"

برج پریمی ایک صاحب طرزِ انشاء پرداز تھے اور اُن کا اپنا مخصوص اندازِ بیان تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اُن کے بیٹے پریمی رومانی کو اُن کی طرف سے دو تحفے ورثہ میں ملے ہیں: خوش نویسی اور تحقیقی مقالہ نگاری۔ پس پریمی رومانی سے کئی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

بدقسمتی کی بات تھی کہ برج پریمی اپنے ظاہراً طور صحت مند ڈیل ڈول اور رعنائی و زیبائی کے باوجود ذیابیطس (DIABETESE) کے عارضہ میں مبتلا ہو چکے تھے، جس نے وقت سے پہلے ہی اُن کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا اور اُن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں دیا۔

پروفیسر پریتم سنگھ

یادوں کے دریچے

بہت برسوں کی بات ہے۔ لگ بھگ اٹھتیس ۳۸ چالیس ۴۰ برسوں کی جب ہم گورنمنٹ ہائی اسکول بڈگام میں ملے تھے۔ ملتے ہی مجھے لگا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کی تلاش تھی۔ بلکہ مل کر مجھے گمان ہونے لگا تھا کہ ہم تو برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس طرح رسمی دوریوں سے آزاد ہو کر ہم ایک دوسرے کے رازدان بن گئے مگر اس قربت میں پریم کی زیادہ ہی دین تھی۔

ہم اسکول میں رہتے ہوئے بھی اسکول کی ہنگامہ بازی سے دور رہنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ہماری اپنی ہی دنیا تھی۔ اور اس دنیا کے دو ہی محبوب تھے۔ ہمارے طالب علم اور اسکول ہذا کے ہیڈ ماسٹر صاحب شری دینا ناتھ ہانجورہ، ایک بے جوڑ ہیڈ ماسٹر، بے مثال استاد اور حسین ترین انسان اور ایک مقناطیسی شخصیت کا نام ہے۔ ہانجورہ صاحب کے ان صفات نے صرف ہم دونوں کو نہیں بلکہ ساری بستی کو اپنا شیدائی بنایا ہوا تھا۔ ہماری آدھی چھٹی بڈگام نالے کے کنارے پہ گزرا کرتی تھی۔ قدرت کی گود میں بیٹھ کر ہم اردو اور پنجابی ادب کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کشمیر کے شعرا عبدالاحد آزاد اور مہجور صاحب ہماری گفتگو کا موضوع ہوتے تھے۔ پریمی کو آزاد کی شاعری سے اچھا

خاصا لگاؤ تھا۔

اِن روزمرہ کی ملاقاتوں کے علاوہ ہم بزمِ ادب بڈگام کی محفلوں میں بھی اکثر ملتے رہتے تھے۔ اُن دنوں اس ادبی انجمن کا بڑا چرچا تھا۔ فاروق بڈگامی کی نظمیں محفلوں کو ترنم سے پُر رنگ کرتی تھیں اور شاہد بڈگامی نے ادبی نشستوں میں جھانکنا شروع کردیا تھا۔ ساقی کی صدا اپنی ہی تھی پریمی مجھ سے پہلے ہی شری موتی لال ساقی سے متعارف ہو چکا تھا۔ اور اُس کی معرفت ہی ساقی صاحب بھی ہمارے حلقۂ دوستی کی زیبائش بنے تھے۔ مجھے اُمید ہے کہ پریمی کی جدائی نے ساقی کو بھی میری طرح مجروح کیا ہوگا۔ متذکرہ بالا ادبی انجمن میں ہم دونوں افسانے پڑھا کرتے تھے اور اُستاد ہونے کے ناطے مقامی ادیبوں کی کاوشوں کی تنقید میں چونچ مارنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ اشتراکی تنقید نے ہمارے ذہنوں کو اپنا دامن گیر بنایا ہوا تھا۔ اور ہم ہر ادبی تخلیق کو اس کسوٹی پر پرکھا کرتے تھے۔

اِن دنوں میں پنجابی آنرز کے بعد ایم۔اے کی تیاری کر رہا تھا۔ اور اسی اسکول میں پڑھاتے ہوئے میں نے ایم۔اے بھی پاس کیا تھا۔ مجھے پوری طرح یاد ہے کہ میری اس کامیابی پر میرے یار پریمی نے جشن منایا تھا۔ سارے سٹاف کو چائے پلائی تھی۔ پریمی ظاہری ہی نہیں بلکہ باطنی طور بھی ایک بہت ہی خوبصورت انسان تھے، وہ تو یاروں کے یار تھے۔ یاروں کی خوشیوں اور غموں کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ وہ اُردو کے ایک بہترین اور کامیاب اُستاد تھے۔ اسکول کے دنوں سے ہی اُس کی تخیل کی پرواز بہت اُونچی تھی اور اُردو کے مایہ ناز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اُن کی پرواز کے خاص محور تھے۔ تب میں منٹو کو ایک جنسی ادیب ہی سمجھتا تھا۔ اشتراکی ادب کا مجھ پر گہرا اثر تھا لیکن پریمی نے مجھے منٹو کی فنی اور موضوعی صلاحیتوں سے آشنا کیا اور جب میں نے منٹو کا ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، کھول دو، اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے ادبی شاہکاروں کو پڑھا تو مجھے حضرتِ منٹو کی ادبی عظمت کا احساس ہوا۔ پریمی کی صحبت کی برکت سے میں نے بیدی، کرشن چندر اور منشی پریم چند جیسے عظیم ادیبوں کے دیدار کئے تھے۔ پریمی کو اُردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ خوب پڑھتا تھا اور میرے پڑھنے کے لئے بہت پیاری ادبی تخلیقات کا انتخاب کر کے لایا کرتا تھا۔ اس طرح وہ میرے عزیز ترین دوست ہوتے ہوئے بھی میرے لئے

اُردو ادب کا اُستاد بن گیا تھا۔

برج کی پیدائشی شرافت، حلیمی اور پختہ ادبی نظر جوہر واقف کار کو گرویدہ بنائے بغیر نہیں رہتی تھی۔ میرے لئے ہمیشہ باعث رشک سی رہتی تھی۔ ہاں شرمیلی مسکراہٹ، تو مجھے حلال کئے بغیر نہیں چھوڑتی تھی۔

مگر شرافت کا یہ پتلا آہنی ارادے کا بھی مالک تھا۔ زندگی کے میدان کارزار میں وہ چٹان کی طرح اپنے نظریئے کا پاسبان تھا۔ یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب ریاستی اسمبلی (کونسل) میں ٹیچرس کے لئے ۲ دو نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن نے حلقۂ انتخاب بڈگام میں چناؤ کا کام ہم دونوں کے ذمے رکھا تھا۔ ان ۲ دو نشستوں کے لئے ایسوسی ایشن نے صوبہ کشمیر سے شری دینا ناتھ نادم اور جموں سے شری غلام رسول آزاد کو ٹکٹ دیئے تھے۔ اس چناؤ میں اُستادوں کے وقار اور اتحاد کے علاوہ سیکولر اقدار کا سوال بھی تھا۔ ہندو اکثریت والے علاقے سے غیر ہندو کو اور مسلم اکثریت والے علاقے سے غیر مسلم کو ٹکٹ دینے کا یہ بنیادی مقصد تھا۔ یہ ریاست کے اُستاد کے محور کی آزمائش تھی۔ فرقہ پرست عناصر کمر کس کر میدان میں اُتر پڑے تھے۔ جیسے ہی انتخاب نزدیک آتا گیا اور چناؤ کی سرگرمیاں تیز ہوتی گئیں۔ میں اور پریمی اپنی چناؤ مہم پر روانہ ہو گئے۔ اس دورے میں ہم تحصیل کے تمام اساتذہ سے ملے۔ درجنوں چناؤ میٹنگوں میں شرکت کی۔ ان میٹنگوں میں برج پریمی نے جس ترقی پسند سوچ، اخلاقی بے باکی اور سیکولر نظریئے کا اظہار کیا تھا وہ قابلِ تعریف تھا۔ اور ہمارے ساتھیوں نے ہمارے کام کی خوب داد دی۔ دوسرے دن جب ہم واپسی پر میرے آبائی گاؤں پہنچے اور گھر میں قدم رکھتے ہی میں نے اپنی ماں سے کہا کہ یہ میرا دوست پریمی ہے۔

"تو پریم اور یہ پریمی ہے۔ میرے لئے تو ایک ہی بات ہے۔"

ماں کے اس برجستہ جملے نے پریمی کو اتنا مسرور کر دیا تھا کہ وہ اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

پریمی کی بے وقت موت اور اچانک جدائی نے مجھے ہلا کے رکھ دیا ہے۔ اُن کے بغیر دنیا سُونی سونی سی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے کہ میں اپنی جوانی کی ایک حسین ترین شے سے محروم ہو گیا ہوں مگر ایک قلم کار کی یاد تو اہلِ زبان کے لئے ایک ناقابلِ فراموش سرمایہ ہوتی ہے۔ میرا یقین ہے کہ جب بھی کبھی سعادت حسن منٹو، پریم ناتھ پردیسی اور منشی پریم چند کی ادبی تخلیقات زیرِ بحث آئیں گی تو میرے ہمدم پریمی کا ذکر ضرور ہوگا۔ تنقید و تحقیق میں پریمی کا اپنا ایک الگ مقام ہے بے باکی اور گہرائی، تنقید نگار پریمی کے دو خاص اوصاف ہیں۔ تنقید کے علاوہ اُس کے قلم نے کئی ناقابلِ فراموش افسانوں کو بھی جنم دیا ہے۔ مجھے آج بھی یہ روز گذشتہ کے افسانے کی طرح یاد ہے کہ جب میں ۱۹۵۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بڈگام سے کالج ڈیپارٹمنٹ میں آیا تھا تو پریمی نے مجھے الوداع کرتے ہوئے کہا تھا "پریم بھائی۔ تیرے بغیر اب اسکول میں میرا دل نہیں لگتا ہے۔ میں بھی جلدی کالج میں آ رہا ہوں۔"

اس دھڑکن کو پریمی نے کیسے حقیقت کا روپ دیا تھا۔ یہ اُسی مردِ جانباز کے حصے میں آتا ہے وہ تو دُھن کا پکا تھا۔ اِس لئے چند ہی برسوں میں اردو میں اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے اُس نے کالج کے ایوانوں میں اپنی صدا بلند کر دی تھی۔ اور پھر ڈاکٹریٹ کر کے کشمیر یونیورسٹی میں دم لیا تھا۔

ہم اکثر و بیشتر یونیورسٹی کے دلکش فضاؤں میں ملتے رہتے تھے۔ وہی گرم جوشی وہی آشنائی ہماری ملاقات کو رنگین بنا دیتی تھی جو ہماری دوستی کا ابتدائی رنگ رہا تھا۔

مگر ہائے اجل کتنی سرد مہری ہے تیری نظر میں؟ کیا تجھے اس حسین انسان پیارے ادیب اور بہترین اُستاد کی جان لیتے ہوئے ذرا بھر کے لئے بھی لرزش نہیں ہوئی ہے؟

میرے والد

سوچتا ہوں کہ آغاز کیسے کروں ؟ میرے پاس الفاظ ہی نہیں کہ والد کے ذات نامے کی تشکیل کر سکوں۔ اُن کی زندگی بے پناہ آلام و مصائب کی داستان تھی۔ چھوٹی عمر سے ہی پیٹ کی اگنی بجھانے کے لئے انھوں نے کون سے پاپڑ بیلے اس کے لئے فرصت درکار ہے لیکن جس اولعزمی کے ساتھ انھوں نے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اُن کی جگرداری کا ہی کام ہے۔

والد ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء میں سرینگر کے ایک نہائیت ہی گنجان محلے درابی یار حبہ کدل (سرینگر) کے ایک اہل علم کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس روز جنم اشٹمی تھی اور لوگ کرشن مہاراج کی جھانکی سجانے اور سنوارنے میں مشغول تھے۔ اسی مناسبت سے والد کا نام برج کشن رکھا گیا۔ ہم دتاتریہ ہیں جو کشمیری پنڈتوں کا نہائیت ہی معزز خاندان تصور کیا جاتا ہے۔ اُن کے والد (یعنی میرے دادا جان) پنڈت شام لال امیہ اپنے زمانے کے مشہور و معروف اُستاد ہونے کے علاوہ شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور افسانے و مضامین لکھتے تھے۔ اُن کے مضامین اور افسانے روزنامہ 'مارتنڈ' (سرینگر) 'وتستا' (سرینگر) 'رنبیر' (جموں)

۱۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ عنقریب ہی دیپ پبلیکیشنز جموں کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی اور کرشن چندر سرینگر میں

ڈاکٹر برج پریمی بین الاقوامی سمینار میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے
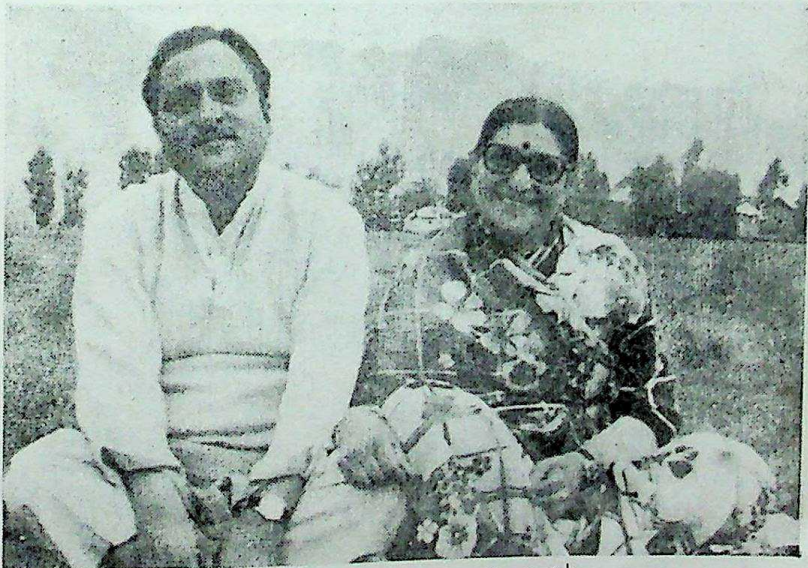
ڈاکٹر برج پریمی ــــ رفیقہ حیات کے ساتھ

بہارِ کشمیر (لاہور) رتن (جموں) اور پھول (لاہور) وغیرہ جیسے اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ آپ پنڈت پریم ناتھ بزاز، کشپ بندھو، پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ وار یکو شاہد کاشمیری، طالب کاشمیری، جیالال کول ناظر، فاضل کاشمیری اور میر غلام رسول نازکی وغیرہ کے ہم عصر اور ان کے حلقۂ احباب سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی کا پاکیزہ مذاق رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سماجی کارکن بھی تھے، اور ادبی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں پابندی کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) اپنی کتاب کشمیر میں اردو (حصہ دوئم) میں رقمطراز ہیں:۔

"شاہد کے ایک اور ہمعصر پنڈت شیام لال ایمہ تھے جو انہیں کی طرح متنوع دلچسپیوں کے مالک تھے۔ ان کے افسانے اور مضامین بھی زیادہ تر مارتنڈ میں شائع ہوتے رہے۔ ایمہ ایک معزز براہمن خاندان سے تھے۔ اردو اور فارسی کے امتحانات بھی پاس کئے تھے اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے ...... لکھنے کا انہیں ابتدا سے شوق رہا، 'مارتنڈ' کے علاوہ جموں کے بچوں کے رسالوں 'رتن' اور 'پھول' میں بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں شائع کرتے رہے۔ ان کے افسانوں میں 'عیار ڈاکو'، 'لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا'، 'غربت' اور 'تختہ دار پر لٹکائے جانے کے بعد پھر زندہ ہو گیا' دلچسپ افسانے ہیں۔ ایمہ نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں اور ان کے اکثر مضامین مذہبی موضوعات یا تہواروں پر ہیں مثلاً نوراترا اور بھگوان رام شری رام چندرجی کے چرنوں میں، جیون مکت سدرشن وغیرہ۔ 'نورہ سے خطاب' میں سرسید احمد خان کے ایک مضمون کی طرح تمنائیں نئے سال سے وابستہ کی ہیں۔[۱]"

حصولِ آزادی سے کوئی دو ڈھائی برس قبل دادا جان بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے آبائی مکان چھوڑ کر سسرالی مکان رنگہ ٹینگ عالی کدل، سرینگر کشمیر مستقل طور پر منتقل ہوئے

۱۔ کشمیر میں اردو (حصہ دوئم) از پروفیسر عبدالقادر سروری، ص

اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ والد محترم نے ابتدائی تعلیم یہیں پر مقامی اسکولوں میں حاصل کی۔ اور پھر ڈی۔ اے بی ٹی وی ہائی اسکول مہاراج گنج سرینگر سے میٹرک پاس کرکے ایس۔ پی کالج سرینگر میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ اسی دوران اُن کے والد (میرے داداجان) طویل علالت کے بعد صرف چوالیس ۴۴ برس کی عمر میں ۱۹۴۹ء میں انتقال کر گئے۔ اپنے دور کے معروف ادیب اور ڈراما نگار پنڈت دینا ناتھ وارِ یچو شاہد کاشمیری روزنامہ مارتنڈ کشمیر کی یکم جولائی ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں آہ۔ پنڈت شیام لال المبہ کے عنوان سے اُن کی بے وقت موت پر اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

"خوش رو، خوش کلام اور خوش سیرت نوجوان قوم کا رضاکار خادم اور ملک کا وفادار سپاہی۔ قومی کاموں میں ہمیشہ پیش از پیش اور خدمت ملک کے لئے ہر وقت کمربستہ۔ دماغ قومی ترقی کے امور کے لئے حساس اور دل قومی درد اور تڑپ سے معمور۔ قومی جلسہ ہو تو اہتمام کے لئے سب سے پہلے حاضر۔ جلوس ہو تو انتظام کے لئے پہلا آدمی موجود ایکتا کا دلدادہ اور قوم کی یکجہتی کا آرزومند۔ قومی پروگرام کو نافذ العمل کرنے کے لئے پرجوش کارکن اور تنظیم کی ہدایات کامیاب بنانے میں سرگرمِ عمل۔ رہنماؤں کا منظورِ نظر اور عوام کا منظورِ قلب........

اردو ادب کا دلدادہ۔ ادبی مجالس اور مشاعروں کا شوقین سخن گو تو نہیں لیکن اعلیٰ درجے کا سخن فہم پہلے درجے کا صحیح نویس۔ اردو درسی کتب کا جزوی مصنف۔ بچوں کی متعدد کتب کا مؤلف۔ کئی مقامی رسالوں اور اخباروں کا نامہ نگار اور مضمون نویس........

آہ! یہ پنڈت شیام لال المبہ تھے جو آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے عنفوان جوانی میں اور اپنے احباب اور اقارب کو داغ مفارقت دے کر تقریباً ڈیڑھ سال

لہ۔ یہ اسکول بعد میں دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔

پنشن پر فالج کا عارضہ لاحق ہوا جس سے جسمانی حالت کلیتاً بگڑ گئی۔ گو اِدھر اُدھر جاتے پھرتے تھے۔ بحالت کمزوری اور بصورت مجبوری بسیار کوشش کے باوجود صحت بحال نہ ہو سکی اور آخر اسی حالت میں زندگی کا سفر ختم کرنا پڑا۔" لہ

پرماتما انہیں کروٹ کروٹ سُورگ عطا کرے۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور زندہ رہتے تو اُردو ادب کو بہت کچھ دیتے۔ انھوں نے گلگت کا سفرنامہ بھی لکھا تھا جو لاپرواہی اور اُن کی جوانمرگی کی وجہ سے تلف ہو گیا۔ دادا مرحوم کے رختِ سفر کی وجہ سے گرہستی کا سارا بوجھ جو ۱۴ برس کے ننھے برج کشن کے کندھوں پر آ پڑا، چنانچہ تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر وہ والد کی خالی آسامی پر ماڈل اسکول امیرا کدل سرینگر میں بحیثیت مدرس تیس ۳۰ روپے ماہوار تنخواہ پر تعینات ہوئے۔ ٹہ اُن کے آلام و مصائب کی داستان کا سرآغاز یہیں سے ہوتا ہے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور مصائب کے پہاڑوں کو ایک نڈر سپاہی کی طرح پھاندتے آگے چلے گئے۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ والد ۱۶ برس کے ہو گئے۔ ابھی اُن کی ملازمت کا دوسرا ہی سال تھا کہ دادی اماں اُن کی شادی کی فکر میں لگ گئیں چنانچہ شہر کے نواحی علاقے فتح کدل میں ایک درمیانی طرز کا گھرانہ دیکھا گیا۔ یہ خاندان سالہاسال سے اپنے پرانی وضع قطع سے اب بھی اسی جگہ جلوہ افروز ہے۔ والدہ دھر خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن کے والد پنڈت مہانند جو دھر اُوسیر تھے شادی پُروقار مگر سادہ طرز پر ہوئی۔ اس میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے جن میں شاعر، ادیب، وکیل دانشور، اُستاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شادی کے کچھ عرصہ کے بعد اُن کا تبادلہ اُوپیورہ کے ایک اسکول میں ہوا۔ اُس زمانے میں گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے وہ روزانہ عالی کدل سے اُوپیورہ تک تقریباً ۲۴ کلومیٹر کی لمبی مسافت بائیسکل پر طے کر لیتے تھے۔ اس کے بعد رات گئے تک پرائیویٹ ٹیوشن پڑھانا اُن کا معمول بن گیا تھا۔ وہ دیر سے گھر لوٹتے تھے۔ کبھی کبھی جب اُن کی بائیسکل خراب ہو جاتی تھی تو یہ

لہ۔ روزنامہ مارتنڈ، سرینگر کشمیر ۲-۳ ہاڑ ۲۰۰۶ بکرمی مطابق ۶ جولائی ۱۹۴۹ء

ٹہ۔ کم سنی کی وجہ سے والد کا تقرر کم سن ماسٹر (BOY SERVICE) کے طور پر ہوا تھا۔

سفر انھیں پیدل ہی طے کرنا پڑتا تھا اور اس طرح سے اُن کی راتیں درد و کرب میں گذر جاتی تھیں۔ اُن کا سارا جسم دُکھتا رہتا تھا۔ یہ سارا درد و کرب جیسے والد کا قیمتی اثاثہ بن چکا تھا۔ بعد میں جب اس درد نے اُن کے جسم اور خاص طور پر اُن کی ٹانگوں میں مستقل جگہ بنالی تو ڈاکٹروں کے مشورے پر انھوں نے اُدھمپور ہی میں سکونت اختیار کی۔ اگرچہ اس طرح سے انھوں نے تھوڑی سی راحت محسوس کی لیکن ایک پچھڑے ہوئے گاؤں میں رہ کر وہ ایک قیدی پنچھی کی سی زندگی گذارنے لگے اور اُن کے اندر کا درد بڑھنے لگا۔ انھیں یہاں بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ غربت اور تنگدستی نے یہاں بھی اُن کا دامن پکڑ لیا۔ اس لحاظ سے والد کا ماضی درد و کرب کی ایک کھلی کتاب ہے۔

ملازمت کے دوران والد نے بی۔ای۔سی (بیسک ایجوکیشن کورس) پاس کیا۔ یہاں بھی وہ اپنی محنت اور ریاضت سے اساتذہ کی توجہ کے مرکز بن گئے۔ انہوں نے ادیب کامل اور ادیب فاضل جیسے امتحانات اچھے نمبرات لے کر پاس کئے۔ یہ تمام سلسلہ دو چار برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد انہوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا تو اپنے احباب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ اس دوران وہ مختلف اسکولوں میں کام کرتے رہے اور اُن کی تقرریاں ہونے لگیں۔ وہ پہلے ٹیچر اور پھر سینیر ٹیچر ہو گئے۔ اپنی قلیل تنخواہ کے باعث اگرچہ اُن کا گذارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا لیکن انھوں نے اپنی خودداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ اتنے غیور تھے کہ کبھی کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ انھوں نے بے شمار مصائب جھیلے لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری۔

۱۹۶۱ء میں والد نے درجہ اوّل میں ایم۔اے (اردو) پاس کیا اور جموں و کشمیر یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ وہ اس امتحان میں پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ انھوں نے بی۔ایڈ کی ڈگری ۱۹۶۰ء میں حاصل کی اور پھر ۱۹۷۶ء میں کشمیر یونیورسٹی نے انہیں اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس زمانے میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم جموں و کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو تھے۔ انہیں والد کی صلاحیتوں کا بھرپور احساس تھا۔ وہ اپنی کتاب کشمیر میں اردو کا خاکہ پہلے ہی ترتیب دے

چکے تھے۔ یہ کتاب ابھی چند سال قبل جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی سرینگر کی طرف سے تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ کتاب کا مواد جمع کرنے کی خاطر والد نہ جانے سرورؔی (مرحوم) کے ہمراہ کہاں کہاں گھومے سرورؔی صاحب لوگوں سے گفتگو کرتے تھے اور اُن کے سپرد انٹرویو ریکارڈ کرنے کا کام رکھا تھا۔ اور مختلف مسودات اور مخطوطات کا جائزہ لینا تھا۔ اس سلسلے میں وہ وادیٔ کشمیر کے بڑے بڑے قلم کاروں ادیبوں صحافیوں شاعروں اور دانشوروں سے ملے جن میں کشپ بندھو مولانا محمد سعید مسعودی امرچند ولیؔ نندلال کول طالب کاشمیری، پدم ناتھ گنجو، مرزا کمال الدین شیدا، دینا ناتھ نادم، جیالال ناظر، دینا ناتھ دھر، جیالال بھان برق کاشمیری، میر غلام رسول نازکی جیالال کول، قیصر قلندر مبارک شاہ فطرت کاشمیری شہ زور کاشمیری، نند لال فاضل آغا اشرف علی اور بیسیوں قلم کار شامل ہیں۔ سرورؔی صاحب والد کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں:۔

"میں نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا تھا۔ خدا کرے آپ کو مل گیا ہو۔ آپ جو دلچسپی اس کام سے لے رہے ہیں اِس کے لئے مشکور ہوں۔ اصل میں یہ آپ ہی کا کام ہے اب کوئی چیز ملے تو اسے اپنے یہاں محفوظ رکھیئے۔ میں اِنشاء اللہ ۲۸ فروری کو سرینگر لوٹوں گا اور سب حاصل کر لوں گا۔۔۔۔۔۔۔"

والد مذہب کے پابند تھے۔ وہ پوجا پاٹھ کے قائل تھے۔ تیرتھوں اور استھانوں کی یاترا بڑے شوق سے کرتے تھے اور چندہ دل کھول کر دیتے تھے۔ اپنے مذہب سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ قلیل جگہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی حیات میں کوئی پوجا کا کمرہ نہ بنا سکے لیکن پھر بھی اپنے کمرے میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی تصاویر سجا سجا کر رکھنے کے شوقین تھے۔ کبھی کبھی باہر سے مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں منگوا کر اپنے کمرے میں رکھتے تھے۔ اور اُن کی پوجا کرتے تھے۔ والد نے اپنے کمرے میں ایک چھوٹی سی الماری رکھی تھی جس میں قسم قسم کی مورتیاں سجا رکھی تھیں۔ اپنے سامنے ہمیشہ سرسوتی کی تصویر رکھتے تھے اور صبح اپنا سر عقیدت سے اُن کے سامنے جھکاتے تھے۔ والد دوسرے مذاہب سے بھی بے پناہ عقیدت و احترام رکھتے تھے۔ آثار شریف حضرت بل سرینگر پابندی کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ والد شیخ العالمؒ

سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے اور کبھی کبھی اُن کی درگاہ چرارشریف میں بھی حاضری دیتے تھے۔ شیخ العالمؒ کی سیرت پاک اور اُن کی تعلیمات پر انہوں نے ایک فکر انگیز مقالہ لکھا ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

والد اگرچہ کسی سیاسی جماعت یا گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے تاہم وہ مارکسی فلسفے کے قایل تھے اور اشتراکی نظام کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک دُنیا میں دولت ہی ایک ایسی چیز ہے جو عوام کو تقسیم کرتی ہے اور امیر و غریب طبقہ میں ایک دیوار کھڑی کرتی ہے۔ دولت نے ہی انسان کو ایک دوسرے سے کوسوں دُور کردیا ہے اور پیار محبت خلوص اور برادری پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ اقبال کے اس نظریئے سے برابر اتفاق کرتے تھے کہ دولت کی مساوی تقسیم ہونی چاہیئے۔ اُن کی تحریریں سامراج، ساہوکار، مذہبی ٹھیکہ دار اور رشوت خور کے لئے اعلان جنگ ہیں۔ ——— وہ ہر ہمیشہ پارٹی کے آدرشوں اور اصولوں کو عزیز رکھتے تھے۔

والد بڑے ہنس مکھ تھے۔ اُن کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑے نرالے انداز سے معاملات حل کرنے کے قایل تھے۔ اُن کے سامنے بھید بھاؤ نام کی کوئی چیز نہیں تھی چھوٹا ہو یا بڑا امیر ہو یا غریب والد سبھوں کو آنکھوں پر بٹھایا کرتے تھے۔ اور ہر کسی معاملے کا حل کسی نہ کسی طریقے سے نکالتے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کا معاملہ ہو یا ریسرچ اسکالروں کی کوئی پرابلم یا کوئی نجی مسئلہ ہو والد معاملے کی تہہ تک جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی حل تلاش کرتے تھے۔ وہ اپنی صحت کی پرواہ تک نہیں کرتے اور رات گئے تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے تھے۔ والد طلباء اور ریسرچ اسکالروں کی کافی امداد کیا کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنی ذاتی کُتب خانے سے کتابیں فراہم کرتے تھے اور کبھی کبھی خود لائبریری میں جاکر اُن کے لئے کتابیں تلاش کرتے تھے بعض اوقات جب دوسرے پروفیسر صاحبان کے اسکالر کسی مشکل سے دوچار ہوتے تھے تو فوراً والد کی خدمت میں حاضر ہوجاتے تھے اور اپنی مشکلات کا حل تلاش کرتے تھے۔ والد یاروں کے یار اور دشمنوں کے دوست تھے۔ ہر کسی کی مدد کرنا اُن کی زندگی کا حاصل بن گیا تھا۔

لباس اور کھانے پینے کے معاملے میں والد زبردست نفاست پسند تھے۔ وہ سیدھے

سادے لباس کے قائل تھے۔ اُن کی ہر چیز صاف ستھری ہوا کرتی تھی۔ کھانے پینے کے معاملے میں والد حد سے زیادہ نفاست پسند تھے۔ انہیں کبھی بھی تنہا کھانا کھانے میں لذت محسوس نہیں ہوتی تھی وہ گھر کے تمام افراد کو بلا بلا کر دسترخوان پر بٹھایا کرتے تھے اور کھانا مزے لے لے کر کھایا کرتے تھے۔

گھر میں اکثر مہمانوں کا ہنگامہ رہتا تھا جب کوئی مہمان گھر میں وارد ہوتا تھا تو والد کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی تھی۔ اس دن گھر میں مارشل لا نافذ ہوا کرتا تھا۔ گھر کے تمام افراد کو والد اُس دن چوکنا رہنے کو کہتے تھے اور جب کسی مہمان کے آنے کی توقع ہوتی تھی تو والد سارے گھر کو صاف و شفاف رکھنے کی ہدایات دیتے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی چیزوں کو سجایا کرتے تھے اور جہاں کہیں کوئی کمی نظر آتی تھی تو اُسی وقت ٹوکا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا تھا۔

والد آج سے پندرہ برس قبل ذیابیطس میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے بعد اُن کی طبیعت نڈھال رہنے لگی۔ انہیں گوٹ اور ریلیکیٹ موشن کی شکائیت ہوئی۔ کبھی کبھی وہ سینے میں درد محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اپنی من پسند غذا کھا نہیں سکتے تھے لیکن دوائیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ شروع سے ہی ڈاکٹر سریندر دھر کے علاج پر تھے جو کشمیر کے اچھے معالجوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر علی محمد جان کے زیر علاج بھی رہتے تھے۔ وہ اکثر ملاحظہ کے دوران ڈاکٹر سے کہتے تھے کہ DOCTOR I HAVE LOST THE TASTE OF MY LIFE — تو ڈاکٹر صاحب اُن کو کافی تسلی دیتے تھے اور لکھنے پڑھنے کی اجازت دیتے تھے۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۰ء کو والد نے معمولی تکلیف محسوس کی تو اُن کا ڈاکٹری معائنہ کروایا گیا۔ ۱۹ اور ۲۰ اپریل کی درمیانی رات کو انہیں تھوڑی سی بے قراری محسوس ہوئی تو انہیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر واڈوا نے اُن کا معائنہ کیا اور طے پایا کہ انہیں گلیکوز ڈرپ لگا دیا جائے۔ ابھی نصف بوتل ہی اُن کے جسم کے اندر داخل ہو چکی تھی کہ ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ دیکھا تو بارہ بجکر پانچ منٹ دن کو وہ راہِ عدم اختیار کر چکے تھے۔ میر غلام رسول نازکی نے قطعہ تاریخ وفات کہی ہے ؎

بیسویں اپریل کو احباب نے سنائی خبر
ایک شیدائے ادب نجھےؔ خوؔ سے واصل ہو گئے
ہم نے جب ملہم سے پوچھا آپ کا سالِ وصال
بولے "برج پریمی خدا کے ساتھ شامل ہو گئے" (۱۹۹۰ء)

پڑھنے لکھنے کی طرف والد کا رجحان شروع سے ہی تھا۔ اکثر انگریزی، ہندی، اُردو اور کشمیری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، شیکسپیئر، فرائیڈ، یونگ، مارکس، رادھا کرشنن، گاندھی، نہرو، کالیداس، تلسی داس، میرا، حبہ خاتون، رسول میر، شیخ العالم، میر، غالب، انیس، اقبال، پریم چند، شرت چندر، سدرشن، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، فراق اور فیض کو دلچسپی سے پڑھ لیتے تھے۔ موپساں اور طالسطائی کے افکار کے تراجم بھی اُن کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔

والدِ محترم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ انھوں نے پہلا افسانہ "آقا" سنہ ۱۹۴۹ء میں لکھا جب وہ صرف تیرہ برس کے تھے۔ یہ افسانہ روزنامہ امر جیوتی سرینگر میں شائع ہوا۔ شروع میں اُن کے والد نے اُن کے ذوقِ ادب کی تہذیب کی۔ اُن کے انتقال کے بعد مشہور افسانہ نگار جناب پریم ناتھ پردیسی کے سامنے انھوں نے زانوئے ادب طے کیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اور انھوں نے اپنے مطالعہ کو ہی اپنا رہنما بنایا۔ "آقا" کے بعد والدِ محترم نے بے شمار افسانے لکھے جن میں "یادِ رنگوں کے جیون میں"، "یہ انسان"، "ننھی کہانیاں"، "میرا گنوار دوست"، "ناکام محبت"، "جھلکیاں"، "لہریں اور کنارہ"، "یہ بھی ایک کہانی ہے"، "ولر کے کنارے پر"، "شرنارتھی"، "اُس کی موت"، "جب اپنا کا خون ہوا"، "ہنسی کی موت"، "فرض"، "مانبل جب سوکھ گیا"، "میرے بچے کی سالگرہ"، "سپنوں کی شام"، "پھٹی پھٹی آنکھیں"، "یہ گیت یا مزار"، "ٹیسیں"، "درد کی لمحوں کی راکھ" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ افسانے ہندوستان کے معروف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ اس دور کی اکثر کہانیاں ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوئیں۔ "سپنوں کی شام" والد کی ایک نمائندہ کہانی ہے۔ جو ماہنامہ بیسویں صدی کے مئی ۱۹۵۷ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ کہانی انھوں نے

حلقۂ اربابِ ذوق کی طرف سے منعقدہ ایک ادبی اجتماع میں پڑھی۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اس کہانی کی زبان کی کافی داد دی۔ اور اس کو ایک اہم کہانی قرار دیا۔ ایک اور کہانی 'میرے بچے کی سالگرہ' انھوں نے ۱۹۵۸ء میں تخلیق کی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری والد کی اس کہانی کا اپنی کتاب 'کشمیر میں اردو' میں بطورِ خاص ذکر کرتے ہیں اور اس کو ان کی بہترین کہانی قرار دیتے ہیں۔

والد 'فاشیں' کے عنوان سے روزنامہ 'مارتنڈ' اور 'جیوتی' میں ایک مستقل کالم لکھا کرتے تھے چونکہ یہ سماج کے ٹھیکہ داروں، رشوت خوروں، ریاکاروں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اس مستقل کالم کے لئے انھوں نے اپنا فرضی نام 'یگ دیپ' اختیار کیا تھا۔ یہ کالم اس زمانے میں بہت مقبول ہوا۔

یوں تو والد کی تنقید نگاری کا آغاز اُن کی افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ہی ہوتا ہے۔ غالب، اقبال، انیس، پریم چند وغیرہ پر انھوں نے اُس وقت مضامین لکھے جب وہ صرف چودہ برس کے تھے۔ انھوں نے غالب، اقبال، انیس، مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، پریم چند، اور کرشن چندر پر چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ اُن کے مضامین بھی اردو کے قابلِ احترام رسائل و جرائد میں شروع سے ہی شایع ہوتے تھے۔ لیکن اُن کا رجحان کہانیوں کی طرف تھا۔ بحیثیتِ ناقد اُن کی شہرت اُس وقت ہوئی جب ۱۹۲۰ء سے منٹو، پریم چند، بیدی، کرشن چندر اور پریم ناتھ پردیسی پر اُن کے مضامین ملک کے معیاری رسائل میں شایع ہوئے۔ اُن کا پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۸۲ء میں 'حرفِ جستجو' کے نام سے شایع ہوا۔ پروفیسر شکیل الرحمن اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ان مقالوں کے مطالعے سے ایک بہتر سوچنے والے ناقد کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب پر والد کو ۱۹۸۲ء میں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے گراں قدر اعزاز سے نوازا۔

والد کا دوسرا مجموعہ 'جلوۂ صد رنگ' کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شایع ہوا۔ یہ مجموعہ ریاست جموں و کشمیر کی تہذیب، کلچر، ادب، صحافت اور تمدن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مظفر آباد (پاکستان) سے تعلق رکھنے والے ایک نامور ادیب پروفیسر صابر آفاقی اس کتاب پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی تصنیف 'جلوۂ صد رنگ' کشمیر کے کئی گمنام اور تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

والد کا ایک اور ادبی کارنامہ سعادت حسن منٹو پر ایک مکمل و مبسوط کتاب ہے۔ یہ دراصل پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے لکھا گیا ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جو ۱۹۸۶ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ اس پر انہیں یو۔ پی اور مغربی بنگال اردو اکادمیوں کی طرف سے اعزازات سے نوازا گیا۔

والد کا ایک اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ذوق نظر ۱۹۸۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ عملی تنقید کے عمدہ نمونے فراہم کرتا ہے۔ اس میں منٹو، پریم چند، سردار جعفری، عبدالقادر سروری، دیویندر ستیارتھی، طالب کاشمیری وغیرہ کی فنکاری سے متعلق چند اچھے مقالے شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کے گیارہ مضامین شامل ہیں جو تنقید، تحقیق ادب اور فلم کے شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں والد خود رقمطراز ہیں:۔

"مجھے پیشہ ور ناقد اور محقق ہونے کا دعویٰ نہیں۔ البتہ فن، ادب، ثقافت اور آرٹ کے مختلف شعبوں سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا ہوں اور اپنا ردِ عمل اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہوں۔"

'کشمیر کے مضامین' ان کا ایک اور تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ والد اپنے مادر وطن سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ اس کے کلچر، اس کی تہذیب، تمدن اور ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر مصر تھے۔ ان کے مطابق کشمیر کے حسن، اس کی رعنائی، اس کی مٹی کی خوشبو، اس کے عرفان کے کتنے لازوال گوشے ہیں جن کو ہماری بے اعتنائی کے دبیز پردوں نے چھپا لیا ہے۔ کشمیر کے مضامین میں والد ان گمنام گوشوں کو نئے سرے سے دریافت کرتے ہیں جو ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے ہیں۔ اس مجموعے کی بھی، اردو دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔

والد ملک کے متعدد رسائل و جرائد سے بھی وابستہ رہے تھے جن میں ماہنامہ ویس (سرینگر)، استاد (سرینگر)، گاشہ آگر (ایم۔ پی۔ ایم۔ ایل ہائیر سیکنڈری انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان) آگہی، بازیافت (شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی) صدف (سرینگر) اور ہند و پاک کے مشہور ماہنامہ سہیل (گیا) وغیرہ شامل ہیں۔ والد نے ان رسائل و جرائد کے ذریعے سے ایک ایماندار صحافی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ریاست کی کئی ادبی اور ثقافتی انجمنوں سے وابستہ رہ چکے تھے۔

والد کی بعض اہم تصانیف اور مسودات غیر مطبوعہ ہیں جن کو شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

برج پریمی کے افسانے

برج کشن ایمہ جو "برج پریمی" کے نام سے لکھتے ہیں، شیام لال ایمہ کے فرزند ہیں جن کے حالات گذشتہ ایک باب میں دیئے جا چکے ہیں۔ برج کشن ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ سرینگر میں تعلیم پائی اور جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اردو ایم اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اب وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے وہ افسانے لکھنے لگے۔ ان کی پہلی کہانی "آقا" 'امر جیوتی' میں شائع ہوئی تھی اس کے بعد جو کہانیاں انہوں نے لکھیں وہ 'بیسویں صدی' (دہلی)، 'راہی' (جالندھر)، 'مصور' (پٹنہ)، 'انشاد' (سرینگر)، 'پگڈنڈی' (امرتسر) اور 'جیوتی' میں شائع ہوئیں۔ برج کشن افسانوں میں کشمیر کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کشمیری پس منظر ان میں زیادہ نمایاں نہیں۔ ان کی ایک کہانی "ہنسی کی موت" جو ماہنامہ 'شعلہ و شبنم' (جون ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئی تھی، ایک پڑھی لکھی ترقی پسند لڑکی اور اس کے دق زدہ شوہر کی کہانی ہے جو شہر کے "مشینی نظام" سے دور شاید انبل جھیل کے قریب کسی گاؤں میں زندگی گذارنے آئے تھے۔ شوہر ایک دکان میں منشی کی ملازمت قبول کر لیتا ہے اور بیوی دن دہاڑے خواب دیکھنے والی خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھتے دیکھتے خود ایک

بھولا بسرا خواب بن جاتی اور قلب کی حرکت بند ہونے سے مر جاتی ہے۔

برج پریمی بھی اپنے عہد کی ترقی پسندی سے متاثر ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں بھی مہاجن، ٹھیکہ دار لمبی توندوں کے ڈراونے سائے، سارے عناصر موجود ہیں۔ "میرے بچے کی سالگرہ" جو ماہنامہ "دیش" (سرینگر مارچ ۱۹۵۸ء) میں چھپا تھا، ایک نوجوان شوہر کو باپ بننے کی خبر سن کر اپنی زندگی کے ماہ و سال گذر جانے کا جو احساس ہوتا ہے اس کا اچھا مرقع ہے لکھا ہے:

"میرا چہرہ گلنار ہو گیا تھا...... میرے ماتھے کی معصوم شکنیں گہری ہو گئی تھیں غم و نزدہ فضاؤں سے اُبل کر میرے خوبصورت چہرہ پر پھیل گیا تھا، اور یوں لگ رہا تھا جیسے آسمانوں کے دریچے کھول کر بڑھاپا آہستہ آہستہ میرے بالوں کی اور بڑھ رہا ہے۔"

برج پریمی کے اور افسانے "چھوٹی چھوٹی آنکھیں" "ناانصافی" "فرض" "اس کی موت" "لمحوں کی راکھ" "منی کہانیاں" "زائیبے" "راجو" "ثبا کے ایک طرف" "یہ گیت یا مزار" "قاشیں" بھی رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ "سپنوں کی شام" فضا اور موقف کے اعتبار سے پریمی کا ایک اچھا افسانہ ہے اس میں کشمیر کی نکھری ہوئی فضا ملتی ہے۔ اومیورہ کے ایک سکول ٹیچر کی کہانی جو اپنے صاحب خانہ کی لڑکی ساجھی اور اس کی سہیلی نوری کو رات میں الاؤ کے قریب بیٹھ کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ایک دن ساجھی جب پہاڑ کی ڈھلوان پر سے اُتر رہی تھی۔ بارش میں بھیگ کر مٹی کا ایک بڑا تودہ چٹان سمیت گرنے کو تھا، ماسٹر خدائی فوجدار کی طرح وہاں پہنچ گیا اور ساجھی کو موت کے منہ سے نجات دلائی۔ اس کے بعد سے ساجھی کو اپنے نجات دہندہ سے اُنس ہو جاتا ہے لیکن ساجھی کی شادی سلامہ سے ہو جاتی ہے اتفاق سے "کولہ وان" کی رسم میں جوندی کا زیر بند کرنے کے لئے انجام دیا جاتا ہے، سلامہ بہہ نکلتا ہے اور ساجھی اسے بچانے کے لئے جاتی اور خود لہروں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ماسٹر صاحب جب اس کی قبر کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں یہ غمزدہ خیال گذرنے لگتا ہے:

"اُدھمپور کی رہنے والی ایک حسین لڑکی کا مزار ہے جس نے اخروٹوں اور ناشپاتیوں کے درختوں کی چھاؤں میں ایک چاندنی رات مجھ سے عہد و پیمان کئے تھے اور جس کے گھنیرے بالوں میں مُنہ چھپا کر میں نے ایک انجانی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔"

برج پریمی کا یہ افسانہ "بیسویں صدی" (مئی ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک اور اچھا افسانہ "ایک پھول ایک کلی" ایک غریب چپراسی کی مصیبتوں کی داستان ہے جس کی بیوی بچے کی ولادت کے وقت ڈاکٹر کے نہ ملنے کی وجہ سے جان بحق ہو جاتی ہے۔ کہانی ڈرامائی انداز سے لکھی گئی ہے اور اس حسرت زدہ زندگی کی کسی قدر مبالغہ آمیز تصویر ہے جو غریبوں کے حصے میں آئی۔

برج پریمی "دیش" اور "اُستاد" کے حلقہ ادارت میں بھی کام کر چکے ہیں۔ ادب اور اس کے بعض پہلوؤں پر ان کے مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔

کشمیر میں اُردو
(حصہ سوم)

پروفیسر منظر اعظمی

برج پریمی کے افسانے

نسیم، سرشار، چکبست سے لے کر پریم ناتھ کشمیری پنڈتوں کا ایک سنہرا رشتہ یا سلسلہ ہے جنہوں نے اُردو ادب کو اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں سے نہ صرف روشن کیا بلکہ وسیع تر بھی۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے قومی یک جہتی اور اُردو کلچر کے دیئے کو شمع بنا دیا جس کی کرنوں نے نہ صرف ان کو روشن تر کر دیا بلکہ اُردو کلچر کو بھی نمایاں کیا۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی برج پریمی بھی ہیں۔ جن کے یہاں اس عہد میں بھی اُردو ادب سے وہی شغف تھا جو اُن کے پرکھوں میں تھا۔ اُردو ادب کے حوالے سے اُن کی جہدِ مسلسل اور پیہم ارتقا پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ برج پریمی نے انشائیے بھی لکھے اور خاکے بھی۔ تنقید بھی کی اور تحقیق بھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ افسانے بھی تخلیق کئے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ کہ ہر میدان میں اپنے نقوش واضح اور روشن رکھے۔

انہوں نے تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ ۱۹۸۲ء میں "حرفِ جستجو" کے نام سے شائع کیا۔ ۱۹۸۵ء میں "جلوۂ صد رنگ" ۱۹۸۶ء میں "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے"

۱۹۸۸ء میں "چند تحریریں" اور سنہ ۱۹۸۹ء میں "کشمیر کے مضامین" چھپے۔ اس ساری تلاش و جستجو میں کشمیر کے ذرے ذرے سے ان کی محبت بالواسطہ یا براہ راست ظاہر ہوتی رہی کشمیری تہذیب اور سماج کے پروردہ ہونے کے سبب انہیں کشمیری عوام خاص طور سے مزدور طبقے کے ساتھ روا نا انصافی ظلم، معاشی نابرابری اور سماجی اور مذہبی استحصال سے براہ راست واقف ہونے کا موقعہ ملا۔ عوام کے ذہن و دل پر کشمیر کی سماجی زندگی نے جو زخم ڈالے ان کا کچا چٹھا انہوں نے اپنے انشائیوں اور افسانوں میں بکھیر دیا۔

ان کا پہلا افسانہ "آقا" کے نام سے روزنامہ امر جیوتی" سرینگر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ شعلہ و شبنم اور بیسویں صدی (دہلی) راہی (جالندھر) مصور (پٹنہ) پگڈنڈی (امرتسر) سنناد اور شیرازہ (سرینگر) دیش اور جیوتی (سرینگر) اور فلمی ستارے (دہلی) وغیرہ میں برابر چھپتے رہے۔ ان کے اندر جو ایک فن کار چھپا ہوا تھا اس نے افسانوں کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اگرچہ ان کا کوئی افسانوی مجموعہ اب تک نہیں چھپا مگر فن کار برج پریمی، انشائیوں اور افسانوں میں جھلکتا رہا۔ قدرت کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا۔ اس لئے وہ تنقید اور تحقیق کی طرف جھکتے چلے گئے اور اسی میں زیادہ شہرت اور امتیاز حاصل کیا تاہم وہ افسانے برابر لکھتے رہے۔

تقریباً پندرہ سولہ سال کی عمر سے انہوں نے افسانہ نگاری شروع کی اور سنہ ۱۹۵۱ء میں مختلف رسالوں اور میگزینوں نے ان کا استقبال کرنا شروع کر دیا تھا۔ "لرزتے آنسو" "آہیں" اور "نشتر" "ناریکھی" وغیرہ اسی زمانے کی یادگار کہانیاں ہیں۔ اسی زمانے میں وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ نوجوان برج پریمی کو کشمیر میں ہو رہی سماجی ناانصافیاں چیخنے پر مجبور کرتی رہیں مگر حیرت یہ ہے کہ ان کے اسلوب میں ادب لطیف کا رنگ جھلکتا رہا۔ فن کار کی چیخ خلاقی کی طرف نہ مڑ سکی راست انداز کی شاعری ہو کے رہ گئی۔ مثلاً ان کا افسانہ "لرزتے آنسو" یہاں سے شروع ہوتا ہے:۔

"تم نے سنا کچھ! روس نے دنیا کے سامنے امن کی پیشکش کی ہے، وہ جنگ نہیں چاہتا!"

وہ مبہوت سنتا رہا۔ "دراصل اس میں لڑائی کی ہمت نہیں۔ اُس کے پاس جنگ کا سامان نہیں۔ بھلا امریکہ سے کیا خاک لڑ سکے گا۔ جو دنیا کا سب سے امیر ملک ہے اور...."

"مجھے اختلاف ہے تم سے — تم غلط ہو۔ روس میں مزدور راج ہے، وہاں محنت کشوں کی حکومت ہے۔ روس امن چاہتا ہے کیونکہ مزدور امن چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دنیا ایک دفعہ پھر ناگاساکی اور ہیروشیما بن جائے — وہ جاپان کی تباہی نہیں چاہتا۔ وہ معصوم ادھ کھلے بچوں سے دودھ کی بوتیں چھیننا نہیں چاہتا۔ وہ کنواری جوانیوں کی بربادی نہیں چاہتا۔ وہ جمود نہیں — زندگی چاہتا ہے۔ چلتی پھرتی، ہنستی مسکراتی زندگی! وہ کوریا کی سرزمین کو سرخ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ انڈونیشیا، ویٹنام، ایران، یونان، جاپان، ملایا، ہندچینی، ہندوستان اور پاکستان کے غریبوں کی موت نہیں چاہتا۔ وہ دنیا بھر کے محنت کشوں کا مسکراتا ہوا اتحاد چاہتا ہے۔"

یہی حال اس عہد کے دوسرے افسانوں کا بھی ہے۔ ان میں خلاقیت سے زیادہ جذباتیت ہے۔ کہانی پن سے زیادہ انشائیہ پن ہے "جب اہنسا کا خون ہوا" بھی خالص انشا پردازی کا نمونہ ہے اور جو انشائیے ہیں وہ تو ہیں ہی۔ اس لحاظ سے ننھی کہانیاں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ ان میں واقعات کا انتخاب اور ان کا حسن متاثر کرتا ہے۔ بہت سے افسانے ایسے ہیں جن میں واقعات سے زیادہ احساسات اور خیالات کے ذریعے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسلوب کی تراش خراش پر زیادہ زور ہے کشمیری پنڈتوں میں فارسی تہذیب زبان کا جو پس منظر رہا ہے وہ ان کی خوش آہنگ اردو سے جھلکتا ہے۔ "میرے بچے کی سالگرہ"، "بہتے ناسور"، "زاویے اور آنسوؤں کے دیپ" وغیرہ اسی طرح کے افسانے ہیں۔

برج پریمی کو کشمیر سے بے حد لگاؤ ہے۔ قومی رہنماؤں سے عقیدت اور کشمیر کی وادیوں جھیلوں، جھرنوں، آبشاروں، چشموں اور مرغزاروں سے ان کی محبت کا ثبوت ہے اور یہ لگاؤ

اُن کے مضامین سے بھی ہویدا ہے اور افسانوں سے بھی مگر ان کے ابتدائی افسانوں میں کشمیر کا پس منظر ہوشربا طریقے سے اُبھر نہیں پاتا۔ وہ مزدوروں غریبوں کشمیر کی خوبصورت مگر مظلوم عورتوں کے غم و اندوہ سے جتنا متاثر ہوتے ہیں۔ کہانی میں ان کو سمیٹ نہیں پاتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شدتِ غم سے زبان ساتھ نہ دے سکے۔ اس کمی کو وہ اپنے زورِ بیان سے پورا کرنا چاہتے ہیں مگر زورِ بیان اسے قصیدہ بنا دیتا ہے غزل نہیں بننے دیتا۔ وہ واقعات کے تسلسل سے کہانی پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر واقعات اور کرداروں کے تضاد اور اُن کے ٹکراؤ سے جو خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی طرف نہ زیادہ زور دیتے ہیں اور نہ اشارہ کر پاتے ہیں کرداروں کی نفسیاتی کشمکش بھی تناسب ہے یہی وجہ ہے کہ بیشتر کردار مجہول ہو کے رہ گئے ہیں لیکن جہاں انہوں نے سماج کے تضاد اور ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے نتائج کا احساس دلایا ہے ماحول اور پس منظر میں شدت پیدا کی ہے۔ کردار بھی زندہ ہو اُٹھے ہیں۔ تاثر بھی پیدا ہوا ہے اور افسانہ نگار اپنے مقصد اور جذبات سے قاری کو احساس دلانے میں کامیاب بھی ہوا ہے۔ ان کے بعد کے افسانے اس کے شاہد عدل ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جوں جوں برج پریمی کے مشاہدے میں وسعت، شعور میں پختگی، افسانے کی تکنیک پر گرفت اور قلم میں زور بڑھتا گیا۔ ان کے افسانوں میں بھی نکھار آیا اور تاثر میں بھی۔ ان کے بعد کے افسانے مثلاً ٹیس درد کی، سپنوں کی شام اور خوابوں کے دریچے وغیرہ اسی طرح کے افسانے ہیں۔ ان میں جذبات پر تخلیق نے لگام دی ہے۔ واقعات آپ سے آپ آگے بڑھتے ہیں اور سماجی جیتا جاگتا ہنستا مسکراتا، ایثار و وفا کا پیکر اور متاثر کرنے والا کردار بھی جنم لے سکا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ برج پریمی افسانوں کے تانے بانے سے واقف نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ جذباتی فن کار ہے۔ اور کشمیر میں ہو رہی سماجی ناانصافیاں اس کو تڑپا دیتی ہیں اور اتنا زیادہ متاثر ہوتا ہے کہ گفتار پر قابو نہیں رہتا۔ مگر جہاں اس نے جذبات کی لہروں پر بند باندھ دیا ہے وہاں اس کے گفتار کا اسلوب بھی نکھر آیا ہے

برج پریمی نے افسانوں میں اگرچہ بہت کم نئے تجربے کئے ہیں لیکن انہوں نے ترقی پسند ادب کے افسانوں کی روایت کو زندہ رکھا۔ اور اسی ڈگر پر چلنے کی کوشش کی جس پر احمد علی اور کرشن چندر گئے تھے۔ ان کے یہاں نفسیات کی گہری تہیں نہیں ہیں جنسیات کی الجھنیں نہیں ہیں مگر سماج کی

کالی راتوں کے گھاؤ اور داغ داغ اُجالوں کی کیفیت ہے۔ اگرچہ انہیں سعادت حسن منٹو اور ان کے فن افسانہ نگاری سے زیادہ لگاؤ رہا اور واقفیت بھی زیادہ تھی مگر وہ خود اپنے افسانوں میں کشمیری سماج کے زخموں کو گننے اور سماجی ناانصافیوں کو اُجاگر کرنے میں لگے رہے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی اونچ نیچ اور زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کرنے کی کوشش کی مگر تیز نشتر لگانے سے گریز کیا محض مرہم اور پھاہے رکھتے رہے۔ یہی اُن کے افسانوں کا اہم پہلو ہے۔

ان کی نثر رواں دواں ہے سادہ بھی ہے اور پُرکار بھی۔ فارسی کی خوش آہنگ ترکیبیں بھی ہیں اور شُستہ تہذیب کا حسن بھی۔ ایک آدھ جگہ نظر بٹو کے طور پر اس طرح کے بھی جملے ملتے ہیں کہ "اس کی زندگی کا شباب اپنی پوری چہل اور تھرک پر تھا" مگر مجموعی طور پر اس کی نثر متاثر کن اور اسلوب جاندار ہے۔ اُردو میں ہر صنف اور ہر معیار کے افسانہ نگار گزرے ہیں مگر برج پریمی ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں اور کشمیر میں اُردو افسانے کی تاریخ اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کی افسانہ نگاری کی خوبیاں بھی اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں گی۔

موتی لال ساقی

برج پریمی کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر برج پریمی نے جس وقت افسانہ نگاری کا آغاز کیا، اُس وقت ہر طرف ترقی پسندی کا شہرہ تھا۔ اُس زمانے میں ہر چھوٹا بڑا لکھنے والا اپنے آپ کو ترقی پسند نظریات سے منسلک کرنا فخر سمجھتا تھا۔ ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ اس تحریک سے وابستگی ہی لکھنے والے کے لئے سند کا درجہ رکھتی تھی۔ پریمی عملی طور پر نہ تو کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین نہ ہی بزم کونگ پوش اور نہ ہی آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس کے ساتھ وابستہ رہے مگر اُس کی ذہنی تربیت میں ترقی پسند ادب کا خاصا عمل دخل تھا۔ خانیار سرینگر میں قایم حلقہ علم و ادب میں اور بعد میں حلقہ اربابِ ذوق سے اُس کا کچھ دیر کے لئے قریبی رابطہ رہا مگر یہ رابطہ بھی دیرپا ثابت نہیں ہو سکا۔ پریمی اُس وقت بھی ترقی پسند نظریات پر قایم رہا۔ جب وادیٔ کشمیر میں ادبی حلقوں میں ترقی پسندی کا سُر خاصا دھیما پڑ رہا تھا۔ یہ سُر دھیما پڑنے کا عمل ۱۹۵۷ء میں شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس بکھر کے رہ گئی اور حلقہ علم و ادب کا وجود تک بھی قائم نہیں رہا۔

پریمی اگرچہ نظریاتی طور پر ترقی پسند ہی رہا مگر اُس وقت جس طرح سے اس تحریک کا شیرازہ بکھر رہا

تھا، اُسے وہ سخت نالاں تھا چنانچہ ۲۰ جولائی ۱۹۵۷ء کو ایک خط میں مرحوم نے میرے نام لکھا:-

"میں یہاں کی مقامی ترقی پسندی سے مطمئن نہیں ہوں میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ میں مارکسی ہوں یا مارکسی فلسفے کا قائل ہوں۔ اُسے اپنا ایمان سمجھتا ہوں لیکن جس طرح سے اُس کا استحصال یہاں ہو رہا ہے میں اُس چیز کا قائل نہیں اور نہیں اُس چیز پہ ایمان رکھتا ہوں۔"

ترقی پسندی کا یہ بھرم کافی دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ حالات و واقعات نے پریمی کو اپنے نظریات پر نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کیا۔ اُس نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کی اور ایک ایسا نظریہ اپنا لیا جس کے ڈانڈے انسان دوستی اور خیرِ عام سے ملتے ہیں۔ قدیم ہندوستانی فلسفے نے پریمی کو حد درجہ متاثر کیا مگر مذہبیات کے معاملے میں وہ قدر پسندوں سے سمجھوتہ نہیں کر سکا۔

پریمی کی ادبی زندگی کا آغاز رواں صدی کی چھٹی دہائی میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں اگرچہ اُس نے تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور خاکے رپورتاژ وغیرہ لکھے مگر اُس کی اکثر تحریروں پر افسانوں کا رنگ ہی غالب رہا۔ خاص کر زبان کے معاملے میں وہ ہر موڑ پر افسانہ نگار ہی رہے۔ اُس کے ہمعصر افسانہ نگاروں میں علی محمد لون، موہن یاور، اختر محی الدین، ہری کرشن کول، دیپک کول، مخمور حسین بدخشی، شیخ بہادر رہبان، حامدی کاشمیری اور پشکر ناتھ وغیرہ کے نام نامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں میں سے اختر محی الدین، ہری کرشن کول اور دیپک کول نے بعد میں کشمیری کو اپنا ذریعہ اظہار بنا لیا۔ مخمور حسین بدخشی کچھ دیر تک لکھتے رہنے کے بعد خاموش ہو گئے۔ حامدی صاحب نے تنقید کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ لے دے کے شیخ بہادر رہبان، پشکر ناتھ اور ڈاکٹر برج پریمی نے اردو کے رشتے کو بنائے رکھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ اُس نے کشمیری میں صرف ایک افسانہ میرے زبردست اصرار پر لکھا جو ۱۹۷۶ء کے "سون ادب" میں شایع ہوا جس کی ادارت میرے ذمے تھی۔ کشمیری سے بے انتہا لگاؤ کے باوجود بھی پریمی نے اُردو کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اور دمِ واپسیں تک اُردو ہی کو اپنا ذریعہ اظہار بنائے رکھا۔

مرحوم پریمی کو سورگ سدھارے اب ڈیڑھ سال ہونے کو آیا۔ اُس کے کارناموں اور اُس کی زندگی کے بارے میں متعدد مضامین اخباروں جریدوں میں شایع ہوئے ہیں لیکن ابھی تک کسی نے بھی اُس کی افسانہ نگاری کے بارے میں کھُل کر بات نہیں کی جو کہ اُس کا بنیادی میدان رہا ہے۔ پریمی نے زیادہ افسانے نہیں لکھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ لکھنے کی صلاحیت سے محروم تھا بلکہ حالات نے اُس سے کچھ اس طرح جکڑ کے رکھا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود لکھ نہیں پاتا۔ میں اکثر اس سے یاد دہانی کرتا کہ بھئی تمہارا اصلی میدان قلم کا میدان ہے۔ دوسری سرگرمیوں کو چھوڑ کر اپنی اصلی جولاں گاہ کی طرف لوٹ آؤ۔ کبھی کبھی وہ تلملا اٹھتا اور پھوٹ پڑتا۔ چنانچہ ایک خط میں اُس نے لکھا ہے:

"تم نے قوت تحریر کے بارے میں پوچھا ہے۔ جب ذہن پر زنگ کی موٹی تہیں چڑھ گئی ہوں۔ تو قوت تحریر کہاں سے آئے۔ سب کچھ کھو چکا ہوں۔ خط تک بھی لکھا نہیں جاتا — بقول قمر جلال آبادی "بانجھ" ہو گیا ہوں۔ ریڈیو والے اس ماہ میگزین کے لئے تقاضا کر رہے تھے لیکن کچھ بھی لکھا نہ جا سکا۔ اب دوسرے ماہ میں نے کہانی دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

ایک اور خط میں اُس نے لکھا ہے:۔

"چند دوستوں نے کل بہت تنگ کیا کہ تم لکھتے نہیں۔ یہ ایک اہم بات ہے جب میں اس بات پر سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں صرف ایک بات آجاتی ہے کہ یا میں سرے سے ادیب ہی نہ ہوں۔ مجھ میں وہ TALENT نہیں اور نہ ہی قوتِ تخلیق ہے یا میرا ذہن پُرسکون نہیں اور میں کافی سے زیادہ پریشان ہوں یا میرا ماحول اس قدر غلیظ، گندہ اور شر انگیز ہے جہاں تخلیق ممکن نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ چھٹی دہائی پریمی کے لئے زبردست پریشانی اور پراگندگی کی دہائی تھی۔ اس دہائی میں جو پاپڑ اسے بیلنے پڑے۔ اُس کے تصور سے ہی وجود کانپ اٹھتا ہے۔ وہ مالی تنگ دستی کے ساتھ ساتھ زبردست ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے جب آدمی کے پاس سر چھپانے اور آرام سے

لیٹنے کی جگہ نہیں اُس کے لیے تخیل ادب کا تصور ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں مگر ان تمام مشکلات اور پریشانیوں میں پڑ کر بھی یہی دہائی پریمی کی افسانہ نگاری کی زرخیز دہائی رہی ہے۔ اُس نے اپنے بیشتر افسانے اور اچھے افسانے اسی دہائی میں لکھے۔ اِس بات سے انکار نہیں کہ اُس نے بعد میں بھی اچھے افسانے لکھے مگر ۱۹۷۷ء کے بعد اُس کی زیادہ توجہ تحقیق و تنقید کی طرف ہوئی۔ پریمی کے بیشتر افسانے ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے پھر بھی جو افسانے مختلف رسالوں اور جریدوں میں شایع ہو چکے ہیں، اُن کا ایک سرسری تبصرہ کرنا یہاں پر مناسب ہوگا۔ مارتنڈ اور جیوتی میں شایع شدہ افسانوں کی تفصیل اس وقت دستیاب نہیں مگر کچھ دیگر رسالوں میں چھپے اُس کے افسانوں کے بارے میں جو کماحقہ، معلومات مجھے ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں۔

پریمی کا افسانہ "پھٹی پھٹی آنکھیں" سرینگر سے شایع ہونے والے ماہنامہ آزاد میں ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا ہے۔ افسانے کے تانے بانے پریمی کے ذاتی زندگی کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ افسانے کا محرک پریمی کا ایک ذاتی المیہ ہے۔ پریمی کی ایک کہانی جس کا نام مجھے اچھی طرح یاد نہیں جنوری سنہ ۱۹۵۸ء کی پگڈنڈی میں چھپی ہے۔ البتہ اسی دور کی کہانیوں "آنسوؤں کے دیپ" اور "ایک پھول ایک کلی" دسمبر سنہ ۱۹۵۷ء کے ماہنامہ "دتیں" میں شایع ہوئے ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شایع ہونے والے جریدے "شعلہ و شبنم" میں پریمی کی ترجمہ کی ہوئی ایک کہانی "امر جیوتی" فروری سنہ ۱۹۵۸ء میں شایع ہوئی ہے یہ کہانی بے حد پسند کی گئی۔

___ کہانی کے اصل مصنف کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ پریمی کی ایک خوبصورت کہانی "سپنوں کی شام" مئی سنہ ۱۹۵۷ء میں بیسویں صدی میں چھپی تھی۔ کہانی کا پس منظر اومپورہ بڈگام کا ایک گاؤں ہے جہاں پریمی کچھ دیر کے لیے بطورِ استاد کام کرتا تھا۔ کہانی کی ہیروئین ساجی ایک بھولی بھالی دیہاتی لڑکی ہے جو زندگی کے داؤ پیچ نہیں جانتی بلکہ محبت اور صرف محبت کرنا جانتی ہے۔ اُس کا افلاطونی عشق ایک مثالی ہے مگر آخر کار زور دبند کے کٹ جانے سے ساجی کے تمام سپنے اُس کے ساتھ ڈوب جاتے ہیں۔ اُس کے دیگر مطبوعہ افسانوں میں "میرے بچے کی سالگرہ"، "لہریں اور کنارہ" اور کچھ خاکے

وغیرہ شامل ہیں۔ پریمی کے اکثر افسانوں پر اپنے ذاتی غموں کی چلمن پڑی ہوئی ہے۔ ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ پریمی کے افسانے گوشت، پوست کے انسانوں کے افسانے ہیں۔ وہ مڈل کلاس رومان کے سرحدوں کو پھاند کر رومانیت اور حقیقت پسندی کا سنگم بن گئے ہیں۔ وہ خلا میں گھومتے تو ہیں مگر اپنے کرداروں کو خلا میں لٹکانے سے انہوں نے پرہیز کیا۔ اُس کے افسانوں کا پس منظر کشمیر کا تمدن ہے۔ عزیز احمد کا ناول آگ پریمی کو اس لیئے عزیز تھا کہ اس میں حقیقی کشمیر کا عکس موجود تھا۔ کشمیر کے حوالے سے پریمی کے افسانوں میں جو کشمیر اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے، وہ کشمیر کے اُن ادیبوں سے مختلف ہے جو پانپور کے زعفران زار سے ڈل کا نظارہ کرتے ہیں۔ پریمی کے افسانوں کا کشمیر آپ کا میرا جانا پہچانا کشمیر ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جس صنف ادب نے پریمی کو ادب کی دُنیا سے متعارف کیا۔ اُس کو پس پشت ڈال کر اب تک اُس کے بارے میں مضامین چھپ چکے ہیں مگر افسانوں کا کہیں نام و نشان نہیں۔ ابھی تک اُس کے تمام تر افسانے کتابی صورت میں چھپنے سے محروم ہیں۔ ہے کوئی سرفروش جو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

کشمیر کے مضامین

ڈاکٹر برج پریمی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا میں ایک مدت سے قائل تھا لیکن ان کی تصنیف "کشمیر کے مضامین" دیکھی تو ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا وہ یہ کہ برج پریمی صرف ادیب ہی نہیں بلکہ ایک مؤرخ بھی ہیں اور مؤرخ بھی ایسے کہ تحقیق کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

ہمارے اردو کے اہل قلم حضرات نے شاعری افسانہ، ناول، ڈرامہ اور ادبی تنقید کے علاوہ اور موضوعات پر کم ہی قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کی زیر نظر کتاب "کشمیر کے مضامین" میں کشمیر فن تعمیر، مارتنڈ، سوریہ مندر (ثقافت)، برنیر اور کشمیر (تاریخ) ان کی کثیر الجہت شخصیت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ میں تو اس کتاب کے چوتھے مضمون "گوبند کول" کو بھی تاریخ اور ادب کا ایک سنگم کہوں گا۔

ثقافت اور تاریخ کے علاوہ اس کتاب میں شخصیات کے زیر عنوان چار، اور ادب کے زیر عنوان پانچ مضامین درج ہیں اور ان سب میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے خوبصورت نثر نگاری جسے ہم READABILITY کا نام دیتے ہیں اور جو روز بروز جنس نایاب ہوتی چلی جا رہی ہے۔

شخصیات کے موضوع پر اس کتاب میں چار مضامین ہیں۔ ایک گوبند کول جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ تین مضامین کے عنوان ہیں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ دھر اور حامدی کاشمیری۔ یہ چاروں

مقالات اگرچہ اُن حضرات کی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں جن کے متعلق یہ لکھے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی بھی اہلِ قلم کے ادبی کارناموں کی اس کی شخصیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے اور شخصیت پر اس طرح لکھنا کہ کسی اہلِ قلم کی شخصیت اور اُس کا ادبی کام دونوں یک جان ہوتے چلے جائیں در اصل ایک مشکل کام ہے۔ برج پریمی اس مشکل منزل سے با آسانی گزر گئے ہیں۔ یہ اُن کی طرزِ تحریر کا کمال ہے۔

چار مضامین اس کتاب میں ادب کے زیرِ عنوان درج ہیں۔ للہ دید کی شاعری منٹو اور شاعر کشمیر مہجور کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک اور کشمیر میں اُردو۔ کتاب کا آخری مقالہ جموں و کشمیر میں صحافت سے متعلق ہے۔

ہم اُردو والوں نے للہ دید کا نام ضرور سنا ہے لیکن اُن کے کام سے واقف نہیں ہیں۔ برج پریمی نے اپنے اس مضمون میں اپنے قاری کو للہ دید کی شاعری کے محاسن ہی سے آشنا نہیں کیا ہے بلکہ اُن کے کشمیری کلام کے اُردو ترجموں کو مضمون میں شامل کر کے فن کار اور اس کے کشمیری نہ جاننے والے قاری کے درمیان جو فاصلہ حائل تھا اُسے ختم کر دیا ہے۔ اس مضمون کی بدولت کشمیری نہ جاننے والے اُردو دان للہ دید کی شاعری سے صرف مفہوم ہی سے آشنا نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے کلام کی شیرینی اور رعنائیت سے بھی لذت اندوز ہو سکتے ہیں۔

"منٹو اور شاعر کشمیر مہجور" ایک بہت ہی انوکھا موضوع ہے اور بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اہلِ قلم حضرات میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی رابطے کی کڑی نہیں ہے لیکن برج پریمی نے اپنے اس مقالے میں حقیقت واضح کی ہے کہ سب سے بڑا تعلق رُوحِ کشمیر ہے جو دونوں کے حق میں جاری و ساری ہے اور پھر منٹو کا یہ لکھنا کہ

"کشمیر میں نے نہیں دیکھا ہے لیکن کشمیری دیکھے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے مہجور کو نہیں دیکھا ہے ......"

ہم میں سے اکثر اُردو والوں کے لئے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہم لوگ بے خبر تھے۔ یہ بات

تو میں جانتا تھا کہ منٹو کشمیر کا عاشق ہے لیکن یہ بات کہ مہجور کو دیکھنے کے لیے وہ اس قدر تڑپ رہا ہے میرے علم میں نہیں تھی۔

اسی طرح حامدی کاشمیری کے متعلق اُن کا مضمون اکثر مجھ الیسوں کے لئے جو سالہا سال سے حامدی صاحب کے قریب چلے آرہے ہیں' اُن کے دوست ہیں' اُن کے متعلق بعض ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جس سے ہم لوگ نا آشنا ہیں۔

میں جموں و کشمیر میں ۱۹۶۸ء سے مقیم ہوں اور ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک تو میں سرینگر ہی میں مقیم تھا حامدی صاحب سے اکثر ملنا ہوتا تھا۔ ادبی جلسوں میں' مشاعروں میں' یونیورسٹی میں' ان کے شعبے میں' اقبال انسٹی ٹیوٹ میں۔ وہ غریب خانے پر اور پریس انفارمیشن بیورو کے دفتر میں بھی آئے ہوں گے۔ میں تو اُن کے گھر میں جا کر اُن سے کئی بار ملا لیکن یہ بات مجھے برج پریمی کی زیر نظر کتاب سے معلوم ہوئی کہ

"ترقی پسند تحریک کے ساتھ رسمی وابستگی کے باعث شروع میں اُن کے افسانوں میں اُن کے یہاں ترقی پسند تحریک کا غیر واضح اثر ملتا ہے"۔

یہ میری کتنی بڑی بے خبری تھی یا بے علمی کہ میں حامدی کاشمیری کو شروع ہی سے ادب کی ترقی پسند تحریک کا مخالف سمجھتا رہا۔

"کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک" اس کتاب کا ایک بہت ہی اہم مضمون ہے۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ لکھنے والا کوئی مؤرخ اس مضمون کو نظر انداز کر کے اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ مضمون ادب کی ترقی پسند تحریک کے تعلق سے ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم پریم ناتھ پردیسی' پیر عبدالاحد' غلام رسول رینزو' پیر غیاث الدین' نور محمد' موتی لال مصری' عاصی' پران ناتھ جلالی' بدری ناتھ نشاط' مدھوسودھن کوثر' شاعر کشمیر مہجور' ارجن دیو مجبور' سومناتھ زتشی' ماسٹر زندہ کول' امین کامل' علی محمد لون' قیصر قلندر' مہندر رینہ' عزیز ہارون' حبیب کامران' بنسی نردوش' نند لال امباردار' پریم ناتھ پریمی' دینا ناتھ المست' دیپک کول'

تیج بہادر بھان، فراق اور دوسرے اُردو اور کشمیری اہلِ قلم کی وہ ادبی سرگرمیاں دیکھ سکتے ہیں جن کا تعلق براہِ راست ادب کی ترقی پسند تحریک سے تھا۔ یہ مضمون کشمیر میں ادب کی ترقی پسند تحریک کا ایک ایسا باب ہے جس کے بغیر ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تاریخ مکمل قرار نہیں دی جا سکتی۔

"کشمیر میں اُردو" پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی اسی نام کی کتاب پر ایک تبصرہ ہے جو ایک طویل محققانہ موضوع کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس مضمون پر برج پریمی صاحب ایک مستند محقق کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

عبدالقادر سروری مرحوم کو برج پریمی" برصغیر کے معتبر محققین اور ناقدین" میں جگہ دیتے ہیں جن کی زندگی کا ہر پل اُردو علم و ادب کی خدمت گزاری میں صرف ہوا لیکن اُن کے دل میں اس قدر جذبہ احترام رکھنے کے باوجود انہوں نے سروری صاحب کی واقعاتی غلطیوں کی پردہ پوشی نہیں کی اور ایک غیر جانبدار محقق کی طرح اپنا فرض نبھایا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دو مثالیں دیکھئے۔

"(سروری صاحب) ایک جگہ پریم ناتھ پردیسی کا فرضی نام علامہ صدیقی سانبوی بتاتے ہیں اور دوسری جگہوں پر یہ نام دینا ناتھ دیگر کو دیتے ہیں۔ نندلال بے غرض کے رتن ناتھ سرشار کے تتبع میں لکھے ہوئے ناول 'ناز یا نہ عبرت' کو ان کا مجموعہ کلام قرار دیتے ہیں صاحبزادہ محمد عمر نور الٰہی کے ناٹک ساگر اور ان کے ڈراموں پر صفحوں کے صفحے سیاہ کرتے ہیں لیکن ان کے اہم کارنامے امانت کی 'اندر سبھا' کا کوئی ذکر نہیں کرتے جسے پہلی بار مرتبین نے سینوں اور ایکٹوں میں تقسیم کیا ہے اور حواشی اور مقدمے کے ساتھ ایک صورت دی تھی۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے پر بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کے سر پر اولیت کا تاج رکھ دیتے ہیں اور چراغ حسن حسرت کو بھول جاتے ہیں جن کا افسانوی مجموعہ کیلے کا چھلکا اور دیگر افسانے بہت پہلے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے تھے افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہیں تو صرف اس دور کے چند افسانہ نگاروں کے بارے میں لکھتے ہیں جن کا مواد انھوں نے مارٹنڈ کی فائیلوں سے لیا تھا جموں کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں وہ اس دور کے ابھرنے والے اہم افسانہ نگار

پریم ناتھ دھر کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ انھوں نے یہاں اسی دور کے دوسرے اہم افسانہ نگاروں مثلاً گلزار احمد فدا، کوثر سیمابی، اختر عسکری، کیف اسرائیلی عبدالعزیز علائی وغیرہ کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ جو اس صدی کے چوتھے دہے میں افسانوی ادب کے میدان میں اہم کارنامے انجام دے رہے تھے۔ ناول نگاری پر آتے ہیں تو صرف نرسنگھ داس نرگس کی پاربتی کا ذکر کرتے ہیں پردیسی کے ناول 'پوتی' کا کوئی ذکر کہیں پر نظر نہیں آتا۔ وہ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سدھیشور ورما کی اہم تصنیف 'آریائی زبانیں' کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں قدرت اللہ شہاب اور ابوسعید قریشی کا ذکر بھی نہیں ملتا جو اسی دور کے آس پاس کشمیر سے باہر اردو کی خدمت گزاری میں مصروف تھے۔ اس کے بجائے وہ مضمون نگاروں میں متھرا دیوی، رادھا رانی اور ریاست کے کئی قائدین کا ذکر اردو نثر کی ترویج اور اشاعت کے سلسلے میں کرتے ہیں جن کا تحریری سطح پر اردو نثر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخبارات کے کالموں سے جو چھان کو دستیاب ہوا وہ بلا کسی تخصیص کے اپنی کتاب میں درج کرتے رہے۔ سروری صاحب کی تصنیف کی اس جلد میں سنین کا کوئی بھی تعین نہیں ملتا۔ یہ بات حتمی طور پر معلوم نہیں ہوتی کہ جس دور کی وہ بات کر رہے ہیں، وہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ تاریخی اعتبار سے جن ادبا اور شعرا کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ کتاب کے آخر میں آگئے ہیں۔ اس کتاب کی تیسری جلد آزادی اور آزادی کے بعد چھٹے دہے کے آخر تک ادبی کارگزاریوں ادیبوں اور شاعروں اور اردو کے خدمت گزاروں کے کارناموں کا احاطہ کرتی ہے۔ سروری صاحب بڑی محنت اور محققانہ کد و کاوش سے کئی کارناموں کو سامنے لاتے ہیں لیکن یہاں بھی ان سے کئی مقامات پر چوک ہوئی ہے۔ انہوں نے ہر اس تحریر کو معتبر سمجھا ہے جو انہیں کسی اخبار یا پرچے میں ملی ہے، وہ کسی سیاسی لیڈر کی کوئی تقریر ہے جس کی رپورٹ کسی مقامی اخبار میں چھپی ہے یا کسی سرکاری افسر کی طرف سے شائع ہوئی کوئی محکمانہ رپورٹ ہے۔"

جموں و کشمیر میں صحافت بھی اسی طرح ایک تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کا مقالہ ہے۔ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ جب برج پریمی کا علمی کام اپنے عروج کی جانب بڑھ رہا تھا وہ ہم سے ہمیشہ

کے لئے جدا ہو گئے۔ ورنہ جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے کچھ مدت میں ان کا نام ڈاکٹر گیان چند، مالک رام، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر اسلم فرخی اور تنویر احمد علوی کے نام کے ساتھ لیا جاتا لیکن غالباً قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اور قدرت کی یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ جس شخص نے صرف اقرار باللسان کے طور پر ہی نہیں بلکہ اقرار بالقلم کے طور پر یہ نثر پارہ ہمیں دیا۔

کشمیر میری جنم بھومی ہے، کشمیر میری ماں ہے
اس کے ہر ذرہ خاک سے مجھے عشق ہے۔
اس کے نیلے امبر کے نیچے
اس کے سرسراتے ہوئے آنچل میں
کتنے رنگ ہیں!
کتنی خوشبو ہے!
کتنی روشنی ہے۔
یہ من کو موہ لینے والا حسن حیرت زا ہے۔

میں نے اس رنگ اس نور اور خوشبو کے لمس کے مٹھی بھر احساس کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی حدت کے آگے میرے لفظ پگھل گئے ہیں۔ جس کے متعلق ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے یہ الفاظ لکھے:-

"برج پریمی کی کشمیریات سے وابستگی عشق کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس بسیار شیوہ موضوع کے بعض مستور پہلوؤں کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ایک سپوت کی طرح مادرِ وطن کی عظمت دیرینہ سے اردو دنیا کو روشناس کر رہے ہیں اور خود اہلِ کشمیر کو بقولِ خلیل الرحمن اعظمی "اپنے ہونے کی خبر دے رہے ہیں۔ برج پریمی کشمیر کی بازیابی کر کے خود اپنی شخصیت کی بازیابی کے نتیجہ خیز عمل سے گزر رہے ہیں۔ وہ جس فراخدلی، کاوش اور لگن سے کشمیر کی ادبی اور تہذیبی عظمت کے مخفی پہلوؤں کو آشکارا

کر رہے ہیں۔ اس سے خود اُن کی شخصیت کی کشادگی، رواداری، حُب الوطنی اور انسان دوستی مترشح ہو رہی ہے۔"

وہی برج پریمی ایک ستم زدہ مہاجر کی طرح کشمیر سے نکلا اور جموں میں قریب قریب کسمپرسی کے عالم میں اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہو سکتا ہے اس وقت اس کی زبان پر غالب کا یہ مصرعہ ہو۔

" مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور! "

پروفیسر محمد حسن

سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے

برج پریمی نے "سعادت حسن منٹو : حیات اور کارنامے" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو ابھی تک منٹو پر شایع ہونے والی سبھی مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے۔ منٹو کے خاندان، اسلاف اور ان کی اپنی شخصیت کے بارے میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے برج پریمی نے بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ یہ باب واقعی اتنا جاندار ہے کہ عصری ادب کے صفحات پر دوبارہ شایع ہونے کا مستحق ہے۔ برج پریمی نے بڑے سلیقے سے منٹو کے افسانوں، ڈراموں، خاکوں اور خطوں کا تنقیدی جایزہ لیا ہے اور منٹو کے فکروفن کو مناسب سیاق وسباق میں گہرائی اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ پورا تحقیقی مقالہ توصیفی ہے اور منٹو کی شخصیت اور فکروفن کی تیزابیت کے منفی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منٹو اپنے دور اور اپنے طبقے کے تضادات کی ساری ناہمواریوں سے عبارت ہے اور اسی لئے وہ مقبول اور محبوب بھی تھے (اور ہیں) اور اسی لئے تنقید کا ہدف بھی۔ بایں ہمہ برج پریمی کی یہ کتاب ابھی تک منٹو پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے اور اردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کے لئے لائق مطالعہ ہے۔

'عصری ادب' دہلی

جولائی۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء

محمد یوسف ٹینگ

جلوۂ صد رنگ

اردو دنیا کا کشمیر سے تعارف کچھ اتھلا اتھلا سا رہا ہے اور وہ کشمیر کو عام طور پر اس کے عوام اور اس کی اسطور سے الگ تھلگ کر کے دیکھتے ہیں لیکن ابتدا ہی میں فوق اور اقبال کا ذکر کسی طرح ٹالا نہیں جا سکتا کہ وہ صورت حال کا بالکل ہی الگ رخ پیش کرتے ہیں اور اگر ان کی تمہید میں کوئی کوتاہی کی جائے تو اس ساری منطق کی بساط ہی الٹ جائے گی۔ فوق اور اقبال دونوں کشمیری تھے اور دونوں نے اردو میں کشمیر کے داغ داغ وجود اور اس کی روح کا نوحہ چھیڑ دیا تھا۔ ابھی وقت کا تناظر ان دونوں شخصیات کو خالص اسطوری حیثیت بخشنے میں مانع ہے لیکن آئندہ یگوں میں یہ بات سب مانیں گے کہ کشمیر کی بیداری کی طرح انہوں نے ہی ڈالی اور اس کی شناخت کا سب سے بلند آہنگ ترانہ انہوں نے ہی چھیڑا لیکن یہ پس منظر اردو کے دوسرے ادیبوں کے سرسری اور رسمی رویئے کو اور بھی زیادہ شدید بنا دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اردو ادب کشمیر کے

ذکر سے خالی رہا ہے۔ ہر دور میں اردو کے ادیب اور خاص طور شاعر اس موضوع کو بڑا مرغوب موضوع پاتے رہے ہیں لیکن وہ زیادہ تر انہی جذبات کی بازگشت کرتے ہیں۔ جو اکبر بادشاہ کے درباری شاعر فیضی نے ظاہر کئے تھے اور جس میں انہوں نے یہاں تک خیال کا پیچ لڑایا تھا کہ انہیں بھنے ہوئے مرغ کشمیر کی فضاؤں میں بال و پر سے دوبارہ آراستہ ہوتے ہوئے نظر آئے تھے۔ فیضی حکمران طبقے کے ترجمان تھے اور وہ ان انسانوں پر نظر ڈالنے سے معذور تھے جو دن رات ستم ہائے روزگار کی جہنم آسا بھٹی میں کباب ہو رہے تھے لیکن بعد میں جب کشمیریوں کو ہوش آیا تو انہوں نے اس انداز کو "ٹڑ بازی" (گپ مارنے) سے تشبیہ دی۔ بہرکیف اردو کا ادیب یا تو اپنے احساس برتری یا اپنی تہذیبی کم مائیگی کی وجہ سے کشمیر کا کوئی باطنی اور بھرپور عکس نہیں ابھار سکا وہ کشمیر کو ایک جاگیردار کے رومانی مزاج کے فرزند کی آنکھ سے دیکھنے کا عادی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر سے متعلق اردو کے ادیبوں کی تحریریں کشمیر کے عرفان کو عام کرنے میں ناکام رہیں۔ ہاں عزیز احمد کے چند ناول اس سلسلے میں اپنی خامیوں کے باوجود بس غنیمت ہیں۔ کرشن چندر اور دوسرے بڑے ادیب بھی کشمیر سے متعلق سلمان رشدی کے انگریزی ناولوں سے مشابہ کوئی چیز پیش نہ کر سکے۔ ان حالات میں اس خلیج کو پاٹنے کا مسئلہ واقعی سنگین نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اردو کا ادیب تو کشمیر پر اس لئے اپنا حق سمجھتا ہے کہ یہاں کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی ہے۔ وہ اردو کے لئے اس ریاست سے ڈھیر ساری رعایتوں کا بھی طلب گار ہے لیکن اسے اب بھی اس ترسیل کی واپسی لہر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے نہ تو کشمیر کی روح کا جھروکہ کھول کر اس کے "فقر دریا آشیں" باطن سے واقف ہونے میں دلچسپی ہے اور نہ کشمیر کے اردو ادیب کے ساتھ برابری کی سطح پر پیش آنے کا خیال ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ چند معزز استثنا کے بغیر

جو بہر حال اس کلیے کو ہی درست ثابت کرتے ہیں، اردو کے ادیب کشمیر کے اردو نگاروں کے متعلق اپنی خلوتوں میں بہت اچھی آرا کا اظہار نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو اس کی کیفیت بقول شاعر ایسی ہوتی ہے ؎

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکوٰۃ

ان حالات میں اس ترسیلی خلیج کو پاٹنے کی صلیب کشمیر کے اردو ادیب کو ہی اٹھانا پڑ رہی ہے اور خوشی کا امر ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کام کسی رعونت کے بغیر پوری دیانت داری اور اہلیت کے ساتھ کر رہا ہے۔

برج پریمی کے اس مجموعے کو میں اس سلسلے کی ایک اہم کڑی سمجھتا ہوں۔ پریمی نے اگرچہ اردو کی کارگاہ میں اپنے اظہار کا جلوہ دیکھنے اور اپنے آپ کی تفہیم کی کاوش کی ہے لیکن اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ اردو دنیا کے لئے کشمیر کے لخت ہائے معتبر کو پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ابھی اردو دنیا کو سعادت حسن منٹو پر پریمی کے وقیع اور شاندار کام کی پوری آگہی نہیں ہے۔ لیکن جوں جوں منٹو کی اسطور کی لو اونچی ہوتی جا رہی ہے اور پریمی کا تحقیقی اور تنقیدی کام عام ہوتا جا رہا ہے ان کے کارنامے کی قدر و قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ بات کسی شک وشبے کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ منٹو کو اپنے دور کے چوکھٹے میں دیکھنے اور ان کے ذہنی وفاداریوں کے سوتے دریافت کرنے میں پریمی کے کام سے اغماض برتنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔ پریمی کا زیر نظر مجموعہ اسے منٹو کتھا کے دائرے سے باہر لا کر ایک آزاد نظر ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔ جس کے ذہنی اور فکری انہماکات کشمیر کے ظاہر و باطن پر محیط ہیں جس کے روحانی ارتباط بڑے متنوع اور رنگا رنگ ہیں جس کے مطالعے کا عمق قابلِ تعریف ہے اور جس کے بات کہنے کا ڈھنگ دل کو بھاتا ہے۔ کشمیر شناسی کا جو پیرایہ اس نے اختیار کیا ہے۔ وہ کشمیریوں

کے بڑھتے ہوئے قومی شعور اور انفرادی اعتماد کے ساتھ ساتھ اردو قاری کے لئے کچھ انوکھے، نا آشنا مگر بے حد شاندار مناظر کی کھڑکیاں کھولتا ہے۔ وہ جب کشمیر پر کچھ پڑھنا چاہتا ہے تو عموماً اسے کشمیر پر غیر ملکی مصنفین کی انگریزی کتابیں یاد آجاتی ہیں۔ نہ معلوم اسے کیوں ان موضوعات پر لکھی گئی اردو کتابیں اب بھی ایسی لگتی ہیں جیسے بقول نیاز فتح پوری "جھوٹ بولا جا رہا ہو" ان کے نازک مزاج پر گراں نہ ہو تو انہیں یہ اطلاع دینے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس کتاب کے بعد اب ان کے شیلف کے لئے کشمیر کی تواریخ و ثقافت کے بارے میں ایک قابلِ اعتبار و استناد کتاب آگئی ہے۔ برج پریمی نے اس کتاب میں کشمیر کی تواریخ و تمدن کے وسیع گوشوں کو کھلی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک موضوع پر ایک الگ تصنیف پیش کی جا سکتی ہے لیکن ایک عام قاری کے لئے اس طشتری میں جو خوان نعمت چنا گیا ہے وہ کشمیر سے متعلق اس کی بڑی حد تک تشفی کرے گا اور اسے کشمیر سے متعلق بعض "بھڑ کے چھتوں" پر تحقیق کے پتھر مارے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ پریمی کے طبعی انکسار کی فتح ہے کہ وہ یہ سب کچھ ایسے برجستہ انداز میں کہتا ہے۔ جیسے "کہہ دی کسی نے پیار کی بات" کشمیر کی اسطور اور تاریخ میں اتنی گہرائی ہے کہ اس کے صدف توڑنے میں ابھی نہ معلوم کتنے غوطہ خوروں کی ضرورت پڑے گی اور پھر بھی سچائی کا گوہر آنکھ مچولیاں کرتا رہیگا۔ نظر کے اس گرداب نے تعصب اور تکلف کی کتنی ہی تعبیریں جنم دی ہیں۔ مثلاً سرینگر کے نام میں اس کے پہلے لفظ "سری" کا یار لوگوں نے فتیلہ لگا دیا ہے۔ اور اس کے ڈانڈے سورج دیوتا سے ملا کر سرینگر کو "سورج کا شہر" قرار دیا گیا ہے۔ یہ جاذب نظر فریب جوزف سٹائین جیسے اہل فن آرکی ٹیکٹ پر بھی چلا ہے جن کا ڈیزائن کیا ہوا۔ سرینگر کا کونشن کمپلیکس ابھی ابھی کھول دیا گیا ہے اس کمپلیکس کا مرکزی نقطہ، سورج کا وہ خاکہ ہے جو اسے سرینگر کے مفروضہ نام سے ملاتا ہے۔

سنگ مرمر سے بنایا ہوا یہ سورن ع اچھی تعمیر کاری ہے لیکن اپنی تواریخی روایت میں
ایک بے حقیقت اطلاع ہے اور پریمیؔ نے یہی بات کہی ہے۔ دراصل کشمیر کا سب
سے بڑا شہر سرینگر تھا۔ اتنا بڑا کہ کشمیر اسی میں ثقافتی طور سما گیا تھا۔ چنانچہ مغل دور
میں سرینگر کو ہی کشمیر کہا جاتا تھا۔ سرینگر کا مطلب تھا۔ "THE CITY" یا مقدس
شہر جس طرح عرب میں مدینے کو المدینہ کہا جاتا ہے۔ اگر پریمیؔ کے اس اظہار حق
سے سٹائین اور اس کو گمراہ کرنے والے دوستوں کی غلط فہمی دور ہو تو اس سے بڑی کارروائی
کیا ہوگی۔ پریمی کا بے تعصب اور وسیع نقطہ نظر اس کتاب کے ہر ورق پر آشکارا
ہے۔ کشمیری تواریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں۔
لیکن پریمیؔ نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔ وہ شنکر اچاریہ کی
پہاڑی کو اس نام کے علاوہ تختِ سلیمان کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔ یہ دوسری بات
ہے کہ یہ دونوں نام اس کے اصل نام کو محو کر کے اختیار کئے گئے تھے۔ یہی بات یہ
ہے کہ اگرچہ پریمی نے بڑے بڑے حواشی یا کتاب نامے درج نہیں کئے لیکن یہ
کتاب کشمیر کی تواریخ و اسطور کے متعلق بہت ہی کار آمد معلومات بہم پہنچاتی
ہے۔ میں قدرے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کی ورق گردانی ان دوستوں
کے لئے ایک مفید مشغلہ ثابت ہوگی۔ جو اپنے آپ کو کشمیریات کے "پہونچے ہوئے"
شاستری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وِتستا کے اصل منبعے للِ دید کے حالات، قدیم کشمیر
کا لباس اور رہن سہن سے متعلق مباحث انتہائی معلومات افزا ہیں۔ اس کتاب کے توسط
سے میں ایک زخم جگر کا خاص طور ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس میں کشمیر کی آبائی گزرگاہوں
کا تو بڑا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ لیکن نالۂ مار تک آتے آتے فاضل مصنف کا قلم کچھ
تھک سا گیا ہے۔ مار کشمیر کی اسطور اور جمالیات سے وابستہ استعارہ ہے۔
اور یہ شالہ مار کے علاوہ نالۂ مار میں بھی موجود ہے۔ اس نالے کے ساتھ نہ معلوم

کیتنے خواب پرستوں اور زین العابدین جیسے جہاں پناہوں کے محل کے دھاگے گندھے ہوئے تھے۔ یہ ہمارے شہر کو ایک پراسرار اور رومان افزا کردار عطا کرتا تھا۔ ایک انوکھا کردار، جیسا وینس کو یورپ میں حاصل ہے۔ لیکن اس امانت کو چند بے خیال اور ناکافی بصیرت و بصارت رکھنے والے لوگوں نے بے دردی سے مٹادیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نالے کو دیرینہ روزی کا روگ لگا تھا لیکن روگ کا علاج کرنے کے لیے جسم کے انگ کو ہی کاٹنا نہ دانشمندی ہے اور نہ ادائیگی فرض اس قسم کے کتنے ہی روگ خود کشمیری قوم کے وجود کو روحانی نالہ مار بنا چکے ہیں لیکن اس کے لئے کشمیری قوم کی اطلاع ضروری ہے نہ کہ اس کا قتل۔ بہر کیف پریمی جیسے ادیبوں جو نالہ مار کے وجود کے آخری شاہد ہیں، کے حوالے سے ہمیں یہ شعر یاد آ تا رہے گا ؂

گفتم اے دولتِ جم، جام جہاں بنیت کو
گفت افسوس کہ آں دولت بیدار بہ خفت

میں پریمی کو اس رویے کے لیے بھی بے حد قابل ستائش مانتا ہوں جو اس نے محی الدین فوق کے متعلق اپنایا ہے۔ فوق نے کشمیر کی بیداری کے لئے اپنی عصری مجبوریوں کے جوکھے میں رہتے ہوئے جدوجہد کی، وہ ہمارے کسی بڑے سے بڑے دانشور یا سیاسی کارکن نے نہیں کی۔ اس نے کئی کنواری زمینوں میں تحقیق و جانکاری کے پہلے ہل چلائے لیکن اس کے حاسدوں نے ہمیشہ ذاتی اور سیاسی وجوہات کی بناء پر اس کی کردار کشی کی مہم کبھی کھلے بندوں اور کبھی کھسر پھسر کے انداز میں چلائی لیکن یہ ہمارے نئے رویے کی غمازی کرتا ہے۔ جب پریمی لکھتے ہیں:۔

"فوق اپنے عہد کے سب سے قد آور ادیب ہیں۔"

امید ہے کہ یہ نیا انداز نظر ہمیں چھوٹی مصلحتوں کی سطح سے اٹھ کر اپنے مشاہیر
اور معاصرین کی زیادہ حقیقت پسند تعین قدر پر آمادہ کر سکے گا۔

یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں پریمی کی پیش کردہ ہر رائے سے اتفاق کیا جا سکتا
ہے۔ پریمی کی عالی ظرفی بعض اوقات معروضی حقائق سے پوری طرح نہیں نپٹتی۔
اس سلسلے میں ملک راج صراف کے "رنبیر" سے متعلق اس کی رائے کا ذکر کیا
جا سکتا ہے۔ "رنبیر" بنیادی طور پر مہاراجوں کا گزٹ تھا۔ اور ان کی وفاداری
کی مہر اپنے ماتھے پر سجائے ہوئے اتراتا پھرتا تھا۔ اس کی ادبی اور صحافتی حیثیت
اول سے آخر تک مشکوک رہی اور اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو وہ جموں یونیورسٹی
میں اس کے پرانے فائل دیکھ کر کر سکتا ہے۔ جہاں سالگرام کول اور محمد الدین فوق
مہاراجوں سے اخبار حاصل کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ وہاں
ملک راج صراف نے اپنی سرکار نوازی سے یہ معرکہ جیت لیا۔ اور بعد میں اپنے
عمل سے ثابت کر دیا کہ مہاراجوں کی نظر کس قدر قیافہ شناس تھی۔ "رنبیر" کو تواریخی
اولیت کے لحاظ سے مقام تو حاصل ہے۔ لیکن کیفیاتی طور پر ایک پن چکی سے
زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو صرف گندم ڈالنے والی ڈالی کے ارد گرد طواف کرتا ہے
پریمی نے کشمیر میں نثر نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبداللہ وکیل اور پریم ناتھ بزاز کا
"رنبیر" سے رشتہ جوڑ دیا ہے۔ جو ثبوت کا محتاج ہے۔ سچی بات ہے کہ اس سے
زیادہ کشمیر میں اردو نثر و نظم کا شوق اجاگر کرنے میں اس سے بیس سال پہلے شائع ہونے
والے لاہور کے ہفتہ وار "اخبار کشمیری" نے ادا کیا۔ ایسا کہنا اس لیے ضروری ہے
کہ سونے اور پیتل کو ایک پلڑے میں نہ تولا جاتا رہے اور تاجرانہ منصوبہ بندی سے
سینچے اور الفاظ سے پالے ہوئے مفروضوں کی اصل صورت واضح ہو۔ اس کتاب
کا ایک نہایت اہم مضمون رام چندر بالی اور آرل سٹائن کے خطوط سے متعلق ہے

یہ اس عظیم خاور شناس اور کشمیر نواز کی زندگی کا ایک نرالا زاویہ نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کی شاندار علمی اور تحقیقاتی مہمات سے ہم سب واقف ہیں۔ اپنی علمی پرواز میں کبھی کبھی اس کی رفتار اتنی تیز اور اونچی ہو جاتی ہے کہ اس کی انسانی حیثیت کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ رام چندر بالی کے نام خطوط میں وہ ایک دلنواز اور دردمند انسان کی حیثیت سے نظر آتا ہے اور یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کشمیر سے اس کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ افسوس ہے کہ حالات نے کشمیر میں دفن ہونے کی اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دی لیکن اس کی ناتمام آرزوؤں نے کشمیریوں پر اس کا ایک قرض چھوڑا ہے جو آج چالیس سال بعد بھی واجب الادا ہے۔ سٹاین کے نام پر قدم کشمیر کے مطالعات کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا اس کا منطقی جواب ہے۔ حیرت ہے کہ کسی کو آج تک کشمیر میں سٹاین کے تعلق ایک سیلنے کا سیمنار منعقد کرنے کی بھی نہیں سوجھی۔

میں پھر پریمی کی اس کتاب کی کشمیریات سے متعلق عام قاری کے لئے اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں۔ مجھے فوق کے بعد اردو میں اس قسم کی ایک کتاب کا علم ہے۔ اور وہ ہے مظفر آباد کے ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصنیف "جلوہ کشمیر"۔ پریمی کا طرز بیان دلکش ہے اور اس نے کشمیر کی تواریخ کے ہزارہا صفحات کو چھان کر چند کیپسول (CAPSUL) قسم کی معلومات اس طرح ابھاری ہیں کہ کشمیر اور اس کے لوگوں کے تواریخی اور تمدنی سفر کے نت نئے رگوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اپنی مقبولیت سے اپنا جواز ثابت کرے گی۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن

حرفِ جستجو

'حرفِ جستجو' ڈاکٹر برج پریمی کے بارہ تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے جس میں عملی تنقید کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ مشرقی اور مغربی اصولِ انتقادیات کی بہتر روشنی میں برج پریمی نے اُردو کے چند فنکاروں کے تخلیقی عمل اور اُن کی تخلیقات کے بعض اہم پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو اور پریم ناتھ پردیسی اُن کے محبوب موضوعات ہیں۔ پریم چند پر تین مقالے، منٹو پر چار اور پردیسی پر دو۔ ان کے علاوہ 'اُردو کے چند قد آور افسانہ نگار'، 'مختصر افسانہ اور خواتین'۔ اور 'دو زاویے' نکون کے ناقد کے زاویۂ نگاہ کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان مقالوں کے مطالعے سے ایک بہتر سوچنے والے ناقد کی آمد کا پتہ چلتا ہے جو فن اور فنکار کے تعلق سے جستجو اور تحقیق کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور تجزیاتی مطالعے کی اہمیت بھی جانتا ہے۔ برج پریمی کے یہ مقالے تحقیق و جستجو اور تجزیاتی مطالعے کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ڈاکٹر برج کشن ایمہ اور ادبی دُنیا کے برج پریمی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی پھر وہ کشمیر کی مختلف ادبی مجلسوں اور محفلوں میں ملے۔ ابتدا ہی سے مجھ پر اُن کی گہری سنجیدگی اور ہر وقت کچھ جاننے اور سیکھنے کی لگن کا اثر ہوا تھا۔ ادبی محفلوں میں اُن کے کئی افسانے بھی سُن چکا ہوں مجلسوں میں مختلف

تخلیقات پر اُن کے تنقیدی تبصروں کو سن کر یقین سا آگیا تھا کہ اگر انہوں نے اُدبی تنقید کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی تو اُن کی وساطت سے اُردو ادب کو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ اکثر میں نے انہیں ادبی تنقید کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہُوا وہی جس کا مجھے یقین تھا۔ سعادت حسن منٹو پر اپنا سیر حاصل تحقیقی اور تنقیدی مقالہ لکھا۔ منٹو پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ ہے جو اب شائع ہو چکا ہے منٹو پر کام کرتے ہوئے وہ مجھ سے بہت قریب رہے اور جانے کتنے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اُن کا یہ کام بہت قیمتی ہے عرق ریزی لگن محنت اور ریاضت سے منٹو کی شخصیت اور اُن کی تخلیقات کا ایک عمدہ تجزیاتی مطالعہ سامنے آتا ہے جس کی داد یقیناً انہیں ملتی رہے گی۔

سعادت حسن منٹو اُن کے لئے ادبیات کے مطالعے کا سرچشمہ بن گئے۔ بڑا فن کار ناقد کے لئے بہتر اور عظیم تر تجربوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے ایک ایسا ذریعہ جس سے فنونِ لطیفہ کے جانے کتنے پہلوؤں کی روشنیوں تک رسائی ہو جاتی ہے منٹو نے انہیں اک یا اُن میں تحرک پیدا کیا اور پھر فنون لطیفہ اور خصوصاً ادبیات کی جمالیاتی اقدار تک پہنچنے کا ذریعہ بن گئے مجھے اس بات کا علم نہیں کہ ڈاکٹر برج پریمی کو میرے اس خیال سے اتفاق ہے یا نہیں لیکن تلاش و جستجو کے پورے سفر میں چونکہ وہ میرے ساتھ رہے ہیں اس لئے یہ بات بہت حد تک وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے منٹو کو موضوع نہ بنایا ہوتا تو ادبی اور فنی اور لسانی اور صوتی اقدار اور خصوصیات پر عام کاروباری نقادوں کی طرح عرصہ تک اُن کی نظر پھسلتی رہتی منٹو نے انہیں ایک دلچسپ پُر اسرار اور بہت پیاری شخصیت دی جس سے انہوں نے ادب میں شخصیت اور فن یا شخصیت اور تخلیق کے پُر اسرار رشتے پر غور کرنا شروع کیا اور اسی طرح منٹو نے انہیں اپنا وہ آرٹ عطا کیا جس سے صرف مختصر افسانہ نہیں بلکہ فکشن کی رُوح تک رسائی پانے کے امکانات روشن ہوئے۔ اس مجموعے میں سعادت حسن منٹو پر جو مضامین ہیں اُن کے مطالعے کے بعد اگر دوسرے مقالوں کا مطالعہ کیا جائے تو غالباً اُس سچائی کی پہچان ہو جائے گی۔

ڈاکٹر برج پریمی چھوٹی بڑی اصطلاحوں سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے اُن کی تنقید لفاظی پسند نہیں کرتی وہ جملے باز نہیں ہیں دُور کی کوڑی لانے کی کوشش نہیں کرتے بوجھل ترکیبوں

میں ذہن کے سہارے مختصر اور آسان جملوں میں پیش کر دیتے ہیں اور یہی بڑی بات ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی آہستہ آہستہ اپنے مطالعے کو وسیع سے وسیع تر کرتے جا رہے ہیں۔ تاریخ، تہذیب، اساطیر، فلسفہ اور مذہب کی اعلیٰ اقدار اور اُن کی جمالیات کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کر رہے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ حرفِ جستجو، کے بعد اُن کے نئے مقالے زیادہ قابلِ توجہ بن جائیں گے۔

ڈاکٹر برج پریمی نے ادبی تنقید کے لئے مارکسزم اور علم نفسیات دونوں کی روشنیوں کو ضروری تصور کیا ہے۔ فن کار کی شخصیت اور اس کے ماحول کے مطالعے میں انہوں نے بعض اہم اور دلچسپ نفسیاتی شعاعوں سے مدد لی ہے۔ اور اسی طرح سماجی اور معاشرتی اور تہذیبی پس منظر اور ماحول کے مطالعے میں مارکسزم کی سچائیوں کو قبول کیا ہے۔ اس لئے اُن کی تنقید کا کینوس صرف پھیلتا ہی نہیں بلکہ مختلف علوم کی روشنیوں کی مدد سے پر کشش اور جاذبِ نظر بھی بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں منٹو کے خطوط، کو بھی پیش نظر رکھئے جو یقیناً ایک قیمتی مضمون ہے۔ گھر کے آنگن میں ایک شخصیت کی پہچان نئے انداز سے ہوئی ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی نے فکشن کو موضوع بنایا ہے اور میں اسے ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے نئے انتقادی مقالوں سے فکشن کے مطالعے کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے۔

ایک اچھے ناقد کا استقبال کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے۔

●

پروفیسر حامدی کاشمیری

کشمیر کے مضامین

کشمیر کی بے مثال زرخیزی کا ثبوت کئی صدیوں سے یہاں کے لوگوں کی غیر معمولی ہنرمندی کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادبی اور شعری نمونوں سے فراہم ہوتا ہے۔ عہد ماضی سے لے کر جدید دور تک سنسکرت، فارسی، کشمیری، ہندی اور اردو زبانوں میں یہاں کے تخلیقی ذہن کا اظہار ملتا ہے۔ اردو زبان کی ملک گیر مقبولیت کے نتیجے میں انیسویں صدی کے اواخر میں اسے ریاست میں دفتری زبان کا درجہ دیا گیا۔ موجودہ صدی کے اوائل سے یہاں کے کئی قلم کاروں نے اسے اپنا وسیلۂ اظہار بنانے کی کوشش کی، چنانچہ موجودہ صدی کے نصف اول میں لکھنے والوں خاص کر شعراء کی ایک بڑی جماعت سامنے آگئی، اور اس نے مروجہ شعری رجحانات کی آبیاری کی۔ اس میں وہ قلمکار بھی شامل ہیں، جو ریاست میں رہ کر ہی لکھتے رہے۔ اور وہ ادیب بھی شامل ہیں جو ریاست سے باہر آباد ہو کر تخلیقی کاموں میں معروف رہے، اور ان

میں سے بعض نام اردو ادب کے لئے سرمایۂ افتخار بن گئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ ادباء جو ریاست کے مستقل باشندے ہیں، اور ریاست ہی میں مقیم رہے وہ بھی حسبِ استعداد اردو ادب کا مرتبہ بلند کرنے میں کوشاں رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا ابھی تک محاسبہ نہیں ہوا ہے۔ بہر کیف، یہ دور کشمیر میں اردو زبان میں تخلیقی سرگرمیوں کا دورِ اول تھا، تقسیمِ وطن کے بعد دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے، جو اب بھی جاری ہے، یہ ایک جذبہ، ہمہ گیر اور بارور دور کی بشارت لے کر آیا ہے، اسی دور میں کشمیر کا فنکارانہ ذہن نئی رفعتوں اور وسعتوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدید مغربی تعلیم اور سائنسی تہذیب سے واقفیت کے نتیجے میں کشمیری ادباء عالمی سطح پر قدیم و جدید کی کشمکش کے نتیجے میں پیدا شدہ بحرانی صورت حال سے نمٹنے لگے۔ وہ علاقائی اور ملکی سطح پر سیاست اور معاشرت کے تضادات، کشمکش اور تشدد پسندی کے شعور سے متصف ہیں۔ اور شخصی سطح پر ذات شناسی کے کرب انگیز مراحل سے گزر رہے ہیں۔ وہ اپنی تہذیبی روایات اور قومی تشخص کے مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ اسی طرح سے شعور کی بیداری اور تحرک کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے، چنانچہ اس کے موثر اظہارات کشمیری اور اردو دونوں زبانوں کے ادب میں مل رہے ہیں۔ اردو ادب کے اس دورِ ثانی میں ادب کی مختلف اصناف مثلاً شاعری، فکشن، تنقید اور تحقیق میں قابلِ قدر کام ہونے لگا ہے۔ جو اب بھی پوری شد و مد سے جاری ہے۔

تحقیق و تنقید کے میدان میں جو حضرات تجسس، شوق اور عرق ریزی سے کام لے رہے ہیں۔ ان میں برج پریمی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ ایک غیر معمولی تخلیقی دور میں تنقید اور تحقیق بھی بالعموم سرگرم کار رہتی ہے۔ جدید دور میں ریاستی سطح پر بھی جبکہ شاعری اور افسانہ نگاری میں پیش رفت

ہو رہی ہے۔ تنقید اور تحقیق کی کارگزاری بھی لائق تحسین ہے۔ برج پریمی بھی تقسیم وطن کے بعد کے ہنگامہ پرور، ثمر بار اور پیچیدہ دور کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے تحقیق و تنقید کا شعبہ چن لیا ہے اور وہ اس میں وسعت مطالعہ کشادہ نظری اور متجسانہ ذہن کا احساس دلا رہے ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ جدید دور میں کئی لکھنے والوں کے دل میں کشمیر کی قدیم تہذیب و تمدن، معاشرت اور ادب کے بارے میں تلاش و تحقیق کا جذبہ موجزن ہے۔ کئی مورخ بھی اس کام میں لگے ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے کشمیر کے ماضی کی بازیافت کا عمل ایک باسعادت اور بامعنی عمل ہے اور یہ فرزندان کشمیر ہی خاطر خواہ طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ یوں بھی ہندو پاک کے معاصر اردو ادب میں اپنی جڑوں کی تلاش کا عمل ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انتظار حسین، عمیق حنفی اور کمار پاشی کے یہاں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ کشمیر میں محمد دین فوق اور عبدالاحد آزاد کے بعد محمد یوسف ٹینگ اور برج پریمی نے یہ بیڑا اٹھایا ہے۔ برج پریمی کی کشمیریات سے وابستگی عشق کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس بسیار شیوں موضوع کے بعض مستور پہلوؤں کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ایک سپوت کی طرح مادر وطن کی عظمت دیرینہ سے اردو دنیا کو روشناس کر رہے ہیں۔ اور خود اہل کشمیر کو بقول خلیل الرحمن اعظمی "اپنے ہونے کی خبر" دے رہے ہیں۔ برج پریمی کشمیر کی بازیابی کر کے خود اپنی شخصیت کی بازیابی کے نتیجہ خیز عمل سے گزر رہے ہیں۔ وہ جس دریا دلی، کاوش اور لگن سے کشمیر کی ادبی اور تہذیبی عظمت کے مخفی پہلوؤں کو آشکار کر رہے ہیں۔ اس سے خود ان کی شخصیت کی کشادگی، رواداری، حب الوطنی اور انسان دوستی مترشح ہو رہی ہے۔ آج کی کساد بازاری

میں اس سے زیادہ وہ اپنے کام کے صلے کی اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟

برج پریمی نقاد بھی ہیں اور محقق بھی اور اپنی شخصیت کی ان دونوں حیثیتوں کا لوہا وہ پورے ملک میں سعادت حسن منٹو پر تحقیقی مقالہ لکھ کر منوا چکے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے ان کا ذہن تحقیق کی طرف زیادہ مائل ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ریاستی اور ملکی ادب سے وابستہ بعض شخصیات کے علاوہ کشمیریات کو اپنا موضوع خاص بنایا ہے۔ برج پریمی کی نگارشات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی تحقیقی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے صرف معلومات اور اعداد و شمار جمع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کو نقد و احتساب کی کسوٹی پر بھی پرکھتے ہیں۔ اس طرح سے ان کی تحقیق بعض نام نہاد محققین کی طرح محض "بے فیض بار برداری" ہو کر نہیں رہ جاتی، بلکہ ایک بامعنی اور ترسیلی کارگزاری بن جاتی ہے۔ وہ جانفشانی سے واقعات کو جمع کرتے ہیں اور پھر ان کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے تاثرات کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے استخراجی عمل کو روا رکھتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان کا طرز اظہار حقیقت و استدلال کی خشک اور سرد سطح پر منجمد نہیں ہو جاتا۔ بلکہ شعری اور افسانوی حرارت، اور لطافت سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پریمی کے دل میں ایک شاعر بسا ہوا ہے اور ان کے اندر کا کہانی کار، جس سے ہم ان کی ابتدائی زندگی میں متعارف ہو چکے ہیں، زندہ ہے۔ اس طرح سے ان کی تحقیق، تنقیدی معروضیت بھی رکھتی ہے اور افسانوی لذت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر مقالہ ایک خوانِ نعمت کی طرح سامنے آتا ہے اور قاری کو بقدر لب و دندان کام نکالنے کی دعوت دیتا ہے۔

حرف جستجو، ذوق نظر، جلوۂ صد رنگ اور چند تحریریں کے بعد برج پریمی کا نیا مجموعۂ مضامین "کشمیر کے مضامین" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مضامین صرف کشمیر سے متعلق ہیں۔ اور کشمیریات کے موضوع کی بوقلمونی کی جلوہ گری کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں کشمیر کے فن تعمیر، صحافت، کشمیری اور اردو شعر و ادب کی اہم شخصیات، ادبی تحریکات، ثقافت اور مورخین کے بارے میں مضامین شامل ہیں۔ ظاہر ہے۔ یہ مجموعہ کشمیر کے ادب، تہذیب اور تاریخ کے بعض نئے ابعاد کو روشن کرتا ہے۔ اور پریمی کو کشمیریات کے ایک بالغ نظر ماہر کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ اردو میں اس نوع کا یہ پہلا منظم اور مربوط تحقیقی کام ہے، جو کتابی صورت میں شایع ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے برج پریمی ایک اہم پیش رو کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔

برج پریمی کے قلم میں روانی ہے، ان کی تحریریں پڑھ کر زبان کی گرانباری یا ثقالت کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ دل کو موہ لینے والی سادگی، ملائمت اور شائستگی کا احساس ہوتا ہے، ان کے مضامین عوام و خواص دونوں کی ضیافت طبع کا سامان کرتے ہیں۔ بقول میر

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

برج پریمی نے جس دردمندی، خلوص اور عرق ریزی سے کشمیر کے حقیقی خدو خال کو ابھارنے کی سعی کی ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ میں موصوف کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے کام کی پذیرائی نہ صرف اہل کشمیر بلکہ ریاست کے باہر دوسرے عاشقان کشمیر بھی کریں گے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما

کہنے کو تو ہم کشمیر کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم کشمیر کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں ہماری معلومات وہاں کے حسن کی دلکشی، موسم کی رنگینی، ماحول کی رومانیت، فضاؤں کی جادوگری، میوؤں کی کثرت، برفیلی وادیوں، چناروں کے سایوں، گنگناتے آبشاروں، مہکتے گلشنوں، لدے ہوئے باغوں، مناظر کی دلآویزی، سرسبزی اور شادابی تک ہی اور جو ہم کشمیر جاتے بھی ہیں تو ہمارے مرکز نگاہ یہی رعنائیاں اور زیبائیاں ہوتی ہیں کہ کشمیر کو جنت نظیر اور فردوس بر روئے زمین کہتے ہوئے داد دیتے اور واپس آجاتے ہیں اور یہی یادیں ہمارے ذہنوں میں بسی رہتی ہیں۔ اسی طرح کشمیر کے بارے میں ہم نے اپنے ادب میں پڑھا بھی کیا ہے؟ کرشن چندر اور رامانند ساگر جیسے ادیب جنھیں کشمیری ہونے کا دعویٰ تھا کشمیر کے تعلق سے ایسی ہی تصویریں پیش کیں کہ اور کچھ نہیں کشمیر میں صرف نسوانی حسن ابل ابل پڑتا ہوا حسینوں کی ادائیں سیاحوں کے لئے وقف ہوں صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے۔ ایسا لگتا ہے کہ کرشن چندر وغیرہ نے بھی کشمیر کو حقیقی طور پر دیکھا نہیں صرف رومانی ناولوں اور افسانوں میں پڑھا ہے اور بس ـــ لیکن کشمیر یہی نہیں، کشمیر کچھ اور بھی ہے۔ کشمیر کا ادب، کشمیر کی صحافت، کشمیر کی تہذیب، ثقافت، تمدنی ادارے وہاں کی تحریک آزادی، حکمرانوں کا جبر، عوام کی بے بسی، ان کی ناداری، افلاس ـــ ان سب کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں؟ کچھ نہیں، خیر کچھ نہیں سہی، بہت کم تو بلاشبہ۔ اکشمیر کو ہم نے رومانی ناولوں اور افسانوں کا موضوع قرار دیا۔ کشمیر کو ہم نے ایک افسانہ سمجھا لیکن کشمیر ایک حقیقت بھی ہے لیکن کتنے ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں، جنھوں نے اس حقیقت کی نقاب کشائی کرنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کی؟ جب کہ خود کئی کشمیریوں نے اس حقیقت کو پیش نہیں کیا، دیکھنا نہیں چاہا تو اوروں کا پوچھنا ہی کیا ہے ـــ ایسے میں ڈاکٹر برج پریمی وہ کشمیری ہیں جنھوں نے کشمیر کو اس کے صحیح رنگ روپ میں دیکھنے اور اوروں کو دکھانے کی ممکنہ حد تک کامیاب سعی کی کہ وہ کشمیری تو ہیں ہی کشمیر کے عاشق بھی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ کشمیر ان

کا پہلا اور آخری عشق ہے تو غلط نہ ہوگا۔ کشمیر کے ادب اور اس کی ثقافت کے بارے میں اوروں نے بھی لکھا ہے لیکن ڈاکٹر برج پریمی کی تحریریں خاص ہیں۔ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبارات سے۔ نیز انھوں نے کشمیر کے بارے میں بھی لکھا اور کشمیریوں کے بارے میں بھی۔ منٹو پر ڈاکٹر برج پریمی کا کام تحقیقی اور تنقیدی دونوں زاویوں سے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جس کے محرکات میں منٹو کی کشمیر سے نسبت اور برج پریمی کی کشمیر سے عقیدت دونوں شامل ہیں۔ مزید برآں اُن کے اور مجموعوں میں کشمیر کے بارے میں مضامین کے علاوہ اُن کے مضامین کے مجموعے 'جلوۂ صد رنگ' 'کشمیر کے مضامین' اور اب 'جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشوونما' کشمیر سے اُن کے عشق کی تفسیر بھی ہیں اور اس عشق کی تعبیر بھی ۔۔۔

"جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" ڈاکٹر برج پریمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو جموں و کشمیر میں اُردو شعر و ادب اور ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کی نوعیت تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔ کشمیر سے جذباتی وابستگی اور عشق کے باعث ان مضامین میں جہاں تہاں غالب کی طرفداری کا احساس ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر ڈاکٹر برج پریمی کا جو مقصد ہے کہ کشمیر کی شعری، ادبی، صحافتی اور تمدنی زندگی کو متعارف کرایا جائے اور ممکنہ حد تک اس کی بھرپور اور رنگین تصویر پیش کی جائے ہاتھ سے جانے نہیں پاتا اور یہی اس کتاب کی سب سے اہم اور امتیازی خصوصیت ہے ۔۔۔ ایک اور بات! اگرچہ کشمیر کی معاشرتی زندگی اور سیاست اس کتاب کا موضوع نہیں لیکن ظاہر ہے شعر و ادب کو معاشرت اور سیاست سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معاشرت اور سیاست سے دور ہوتے بھی نہیں بلکہ معاشرت اور سیاست کے پس منظر میں شعر و ادب کے خد و خال واضح ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی نے جہاں تہاں معاشرتی اور سیاسی زندگی کے تناظر میں شاعروں، ادیبوں، شعری اور ادبی تحریکات اور اصناف کے بارے میں ترقیم کیا ہے یہ اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف کشمیر میں آزادی کی عوامی تحریک کو آگے بڑھانے میں صرف سیاستدانوں کا نہیں شاعروں اور ادیبوں کا بھی گرانبہا حصہ رہا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی نے جموں و کشمیر میں اُردو نثر، اُردو افسانہ، ناول، صحافت، تنقید، ڈرامہ، ترقی پسند تحریک، ریاستی کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات، ریاست کے تمدنی اداروں اور جموں و کشمیر میں اُردو ادب کے نمائندہ فن کاروں کے بارے میں سیر حاصل انداز میں قلم اُٹھایا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے کشمیر میں اُردو جیسی ضخیم تاریخ مرتب کی جس کو کشمیر کی ریاستی کلچرل اکادمی نے شائع کیا ہے ۔۔۔ تحقیق میں کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر برج پریمی نے سروری صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی جگہ پر اُن کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے کیونکہ یہ تصنیف جو تین جلدوں پر مشتمل ہے

اُردو ادب پر ایک احسان سے کم نہیں۔" یا یہ کہ پروفیسر سروری مرحوم نے اپنی کتاب "کشمیر میں اُردو" میں ایسے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی نشاندہی کی ہے جن کے نام سے آج کوئی واقف نہیں — اسی کے ساتھ ڈاکٹر برج پریمی نے سروری صاحب کے بعض تسامح کی طرف خاص طور پر اپنی کتاب "کشمیر کے مضامین" میں اشارے بھی کئے ہیں لیکن مجموعی طور پر کشمیر کے اُردو ادب کے بارے میں اُن کے مضامین زیادہ تر سروری صاحب کے حوالہ سے ہیں یا اس میں ترمیم و تصحیح ہیں یا اضافہ ہیں۔ بہر کیف ڈاکٹر برج پریمی نے تحقیق کا حق نہایت دیانتداری سے ادا کیا ہے۔ سروری صاحب سے انہیں بجا طور پر شکوہ تھا کہ کہیں کہیں بعض افسانہ نگاروں کا ذکر نہیں کیا، کہیں بعض فنکاروں کی کسی تخلیق یا تخلیقات کے نام درج نہیں کئے وغیرہ وغیرہ تحقیق میں اس نوع کی فروگذاشتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ خود "جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" کا دیباچہ (جلنے والوں کی یاد آتی ہے) تحریر کرتے ہوئے موتی لال ساقی نے کچھ ایسا ہی شکوہ ڈاکٹر برج پریمی سے بھی کیا ہے کہ کتاب کا وہ حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ریاست کے نمائندہ اُردو فن کاروں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ کتاب کے اس حصہ میں توسیع کی مزید گنجائش ہے۔ لیکن اس معمولی سی اور ناگزیر فروگذاشتوں کے باوجود "جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" اپنے موضوع پر اہم کتاب ہے۔ سروری صاحب کو اُن کی اچانک موت نے "کشمیر میں اُردو" پر نظر ثانی کا موقعہ نہیں دیا۔ اور "کشمیر میں اُردو" سروری صاحب کے انتقال کے بعد محمد یوسف ٹینگ نے اپنے حاشیوں کے ساتھ شایع کی۔ "جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" بھی ڈاکٹر برج پریمی کے اچانک انتقال کے بعد اُن کے سعادت مند فرزند پریمی رومانی نے شایع کی ہے ظاہر ہے اگر دونوں کتابیں اپنے مرتبین کی حیات میں شائع ہوتیں تو اُن کی صورت کچھ اور ہوتی۔ سروری صاحب اور ڈاکٹر برج پریمی میں یہ قدر مشترک اہمیت رکھتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں یہ اُس تعلق خاطر کا نتیجہ ہو جو ڈاکٹر برج پریمی کو سروری صاحب کی ذات سے تھا۔

"جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما" میں ڈاکٹر برج پریمی نے سب سے پہلے کشمیر میں اُردو ادب کی ابتدا پر روشنی ڈالی ہے۔ دیگر مضامین کی طرح یہ بھی ایک معلوماتی مضمون ہے جس میں انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وزیر اعظم کرپا رام کے ایما پر ریاست کی انتظامی صورت حال پر اُردو میں رپورٹیں ترتیب دی گئیں اور انہی رپورٹوں کو ریاست میں اُردو نثر کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ نیز ڈاکٹر پریمی کے بموجب اسی مہاراجہ کے دور میں چودھری مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۴ء - ۱۸۶۵ء میں بخارا کا سفر کیا اور واپسی پر اپنا سفرنامہ اُردو میں لکھا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر اُردو کی پہلی تحریر تسلیم کی گئی۔ اسی طرح صحافت کے سلسلے میں ڈاکٹر پریمی کی تحقیق لائق قدر ہے کہ ۱۸۸۲ء

میں بدیا بلاس پریس کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال ریاست کا پہلا اخبار 'بدیا بلاس' سرکاری گزٹ کے طور پر شائع ہوا۔ ویسے عوامی سطح پر ریاست کا پہلا اخبار 'رنبیر' ۱۹۲۴ء میں جموں سے لالہ ملک راج صراف نے جاری کیا اور سرینگر سے پہلا اخبار 'وتستا' ۱۹۳۳ء میں پریم ناتھ بزاز نے جاری کیا اور بزاز اور شیخ عبداللہ نے مشترکہ طور پر ریاست کا پہلا مصور ہفت روزہ 'ہمدرد' ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی نے اس پس منظر کو نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اخبار نکالنے کی مساعی تو عرصہ دراز سے جاری تھیں لیکن چونکہ یہ بیشتر ڈوگرہ حکمرانوں کے اپنے مفادات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اس لیئے اس کی اجازت نہیں دی گئی اور کشمیریوں نے مجبوراً بالخصوص لاہور سے اخبارات جاری کیئے جن میں کشمیر کے سیاسی اور معاشرتی حالات کو پیش کیا گیا۔

جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ عزیز احمد کو کرشن چندر سے شکوہ تھا کہ کرشن چندر نے کشمیری ہونے کے باوجود اپنے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کی حقیقی زندگی کو پیش نہیں کیا۔ خود عزیز احمد نے کشمیر کے بارے میں اپنا معرکہ آرا ناول 'آگ' لکھا۔ اس ناول کے بارے میں بعض لوگ عزیز احمد پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ انہوں نے کشمیر سے انصاف نہیں کیا لیکن ڈاکٹر برج پریمی نے جن کا کشمیر سے اٹوٹ رشتہ ہے اور جو کشمیر کے سچے عاشقوں میں شمار ہوتے ہیں، نہایت معروضی انداز میں عزیز احمد کے 'آگ' کا جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ یہ اقتباس ان کے کسی مضمون سے نہیں، موتی لال ساقی کے موسومہ ان کے خط سے لیا گیا ہے لیکن اس سے ان کے سائنٹفک اور معروضی تنقیدی موقف کا اندازہ ہوتا ہے۔ برج پریمی ۱۱ فروری ۱۹۵۷ء کو موتی لال ساقی کو لکھتے ہیں:۔

"..... عزیز احمد کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے کشمیر کو بدنام کیا ہے۔ میرے دل میں اس کے خلاف ایک زہر تھا۔ آج وہ زہر ڈھل گیا ہے۔ کم از کم 'آگ' میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں ملتی جس سے کشمیر بدنام ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کچھ کہانیاں ایسی لکھی ہوں مگر ناول جس کا کینوس کافی بڑا ہوتا ہے بدنام کرنے کا بہت بڑا INSTRUMENT ہو سکتا تھا۔ عزیز احمد نے جس کشمیر کو پیش کیا ہے، وہ حقیقی کشمیر ہے۔" (ص ۱۱)

کشمیر کے بارے میں پریم ناتھ پردیسی کی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کشمیر کی حقیقت کیا ہے؟ اس سرزمین کی اصل تصویر کیا ہے؟ اور وہ کس کشمیر کی کیسے ترجمانی چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پردیسی کی اکثر کہانیوں میں کشمیر کے خوبصورت مناظر نہیں آتے۔ انھوں نے بہت کم یہاں کی جنت کا ذکر کیا ہے بلکہ یہاں کے جہنم کدوں کی تصویر کھینچی ہے۔ یہاں کے فن کاروں، کاریگروں، مزدوروں، کسانوں اور افلاس کے مارے لاکھوں لوگوں کی بدنصیبی کی کہانیاں رقم کی ہیں جو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے استحصال کے شکار ہو رہے تھے۔" (ص ۱۸۰)۔

اس کتاب میں شعروادب کی مختلف اصناف مختلف پہلوؤں اور کئی شعراء و ادباء کے فن پر ڈاکٹر برج پریمی نے نہایت شستہ انداز میں تنقید کی ہے جس سے اُن کے مطالعہ کی وسعت نظر کی گہرائی اور تنقیدی ذمہ داری کو محسوس کرنے کا اظہار ہوتا ہے۔ سلجھی ہوئی زبان اور رواں اسلوب نے ان کی تحریروں کو شگفتہ اور دلپذیر بنا دیا ہے۔ سب سے پہلے نئے افسانہ کے بارے میں یہ اقتباس:-

"۱۹۶۵ء کے آس پاس اردو میں نئے افسانہ کی شروعات ہوتی ہیں اور اب افسانے نئی سمتوں کی طرف مڑنے لگتا ہے۔ نہ صرف موضوعاتی تازگی اور اسلوب کی شادابی کے لئے راہیں متعین ہونے لگتی ہیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو منعکس کر رہا ہے۔ زندگی میں جو انتشار اور اضطراب پیدا ہوا ہے۔ اسی سے افسانہ عبارت ہو گیا ہے۔" (ص ۳۶، ۳۷)۔

اور یہ بات اگرچہ کشمیر کی ناول نگاری کے ضمن میں کہی گئی ہے لیکن من حیث المجموع اُردو کے تقریباً تمام ناول نگاروں پر صادق آتی ہے۔ ڈاکٹر پریمی نے بات کہی بھی ہے کچھ ایسے انداز، ایسے اسلوب میں:

"آج ہمارے ناول نگاروں کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ناول محض قصہ گوئی کا یا داستاں طرازی کا دوسرا نام نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی کی خوشیوں اور تلخیوں کو اس کے غموں اور شادمانیوں کی تصویر پیش کرنے کا ایک بڑا وسیلہ ہے آج کی بدلتی ہوئی زندگی میں وہ ایک بدلے ہوئے ردِ عمل کا اظہار بھی ناول کے فارم میں کرتا ہے۔ آج ہمارا ناول نگار نہ مبلغ ہے اور نہ سیاستداں اور نہ ہی خطیب وہ خود آگاہ اور خود شناس بن گیا ہے۔" (ص ۲۵)۔

پریم چند ظاہر ہے کشمیری نہیں لیکن پریم چند سے کس کو مفر ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے پریم چند کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور بڑا حقیقت پسندانہ، ملاحظہ ہو:-

"پریم چند مثالیت پسندی سے حقیقت پسندی کی طرف آ گئے تھے اور نئے فنی تصورات

اور امکانات کے ساتھ معاشرتی اور سیاسی زندگی کو پیش کرنے لگے تھے۔" (ص ۲۸)

اسی حقیقت پسندی کے ذیل میں ـــــ پشکر ناتھ کشمیر کے ایک ممتاز کہانی نویس ہیں۔ ابتداً انھوں نے رومانی کہانیاں لکھیں لیکن جلد ہی زندگی کی حقیقتوں پر نظر ڈالی اور ان کو اپنے فن کا عنوان بنایا۔ ڈاکٹر برج پریمی نے پشکر ناتھ کے قبل ازیں موقف پر نظر رکھنے کے باوجود ان کے فن کے تبدیل شدہ رخ کو ملحوظ رکھ کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کو سراہا ہے اس انداز میں:۔

"پشکر کا مشاہدہ عمیق ہے وہ فلسفہ نہیں بگھارتے اور نہ سیاست کے کرتب دکھاتے ہیں۔ وہ روزمرہ کی زندگی سے اپنی کہانیوں کا مواد اخذ کرتے ہیں۔ پشکر ناتھ کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور ایک منجھا ہوا شعور بھی۔" (ص ۱۹۹)۔

اور اب آل احمد سرور اور حامدی کاشمیری جیسے اصحاب قلم کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی کے خیالات سے اندازہ ہوگا کہ نئے ادبی میلانات پر بھی ان کی نگاہ ایسی ہی تیز اور گہری ہے اور ادب فہمی کا ان کا شعور تیکھا اور نکھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے سرور صاحب کا ذکر ان شخصیتوں کے ذیل میں کیا ہے جن کا ایک قابل لحاظ عرصہ کشمیر میں گزرا۔ تنقید میں سرور صاحب کے مقام کو اوروں نے بھی متعین کرنے کی سعی کی ہے لیکن برج پریمی نے سرور صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی ادبی شخصیت کے بدلتے ہوئے رنگوں اور ان کے انداز تنقید کو نہایت تیکھے تلے انداز میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"سرور صاحب اردو تنقید کی سب سے بلند قامت شخصیت ہیں۔ ان کے سایے میں اردو ادبی تنقید کے بالغ پر نکل آئے۔ اردو تنقید کے کئی دبستان ابھرے لیکن سرور صاحب کی آواز مختلف اور منفرد رہی۔ انھوں نے ہر بدلتے ہوئے لہجے کو ہمدردی اور خلوص سے دیکھا اور پرکھا۔ اس لئے وہ قدیم و جدید دونوں طرح کے نظریات اپنانے والوں کے قریب ہیں۔ وہ صرف اقبالیات کے ہی ماہر نہیں۔ ادب کے بیشتر شعبوں پر وہ ماہرانہ نظر کے مالک ہیں۔" (ص ۹۵)۔

اور حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید کی تحریروں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی کا اقتباس پڑھیں:۔

"حامدی کی تعبیر و تعین قدر کی تنقید قاری کو شعری کائنات کی اہم قرار

دیتے ہیں اور آرٹ کی فنی اور جمالیاتی قدر و قیمت کو اہمیت دیتے ہیں۔ حامدی روایتی تنقید سے انحراف کرتے ہیں وہ جدیدیت اور نئی حسیت سے متاثر ہیں لیکن اس میں بھی انھوں نے اپنا ایک الگ راستہ کھوج نکالا ہے۔" (ص ۸۷)۔

قطع نظر اس کے بھی ڈاکٹر برج پریمی نے شعر و ادب کے اور پہلوؤں کا عمومی اور کشمیر کے پس منظر میں خصوصی طور پر سیر حاصل جائزہ لیا ہے تحقیق و تنقید اُن کے ہاں پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے وزن و وقار اور اعتماد و اعتبار میں اضافہ کرتے ہوئے انہوں نے کشمیر میں ترقی پسند تحریک انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقہ ارباب ذوق کی حقیقت، اُردو کے سرکاری زبان کے موقف، سیاسی میدان میں شیخ عبداللہ کی سرگرمیاں، نیشنل کانفرنس، ڈوگرہ راج کے خلاف ہندو مسلم متحدہ جدوجہد اور کشمیر کے تمدنی اداروں پر کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ روشنی ڈالی ہے۔ شعر و ادب تو اُن کا موضوع ہے ہی۔ ہاں کہیں کہیں تکرار کا احساس ضرور ہوتا ہے اور یہ بات کھٹکتی بھی ہے لیکن چونکہ ان موضوعات پر علیحدہ علیحدہ مباحث کئے گئے ہیں اس لئے اس تکرار سے دامن بچانا شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر کشمیر کے شعر و ادب، تہذیب و ثقافت اور کہیں کہیں سیاست و معاشرت کے بارے میں یہ کتاب ایک چھوٹی موٹی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ وہ کام ہے جس کو اوروں ہی نے نہیں خود اہلِ کشمیر نے بھی بہت کم کیا ہے۔

●

منظہر امام

سعادت حسن منٹو ۔ حیات اور کارنامے

یادش بخیر سعادت حسن منٹو چاہتے تھے کہ کسی رسالے کا منٹو نمبر شائع ہو اور اُسے وہ خود ایڈٹ کریں۔ منٹو یہ حسرت لئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی زندگی میں ان پر کسی رسالے کا کوئی نمبر، کوئی خصوصی شمارہ، کوئی گوشہ، کوئی تفصیلی مطالعہ شائع نہیں ہوا، لیکن اُن کے انتقال کے بعد اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک LEGEND بن گئے تھے۔ ان کے افسانوں پر مقدمے، ان کی کثرتِ شراب نوشی، اُن پر جنون کے حملے، اُن کا ایک بوتل ٹھرے یا وہسکی کے ادھے کے لئے ایک نشست میں افسانہ لکھ کر ایڈیٹر کے حوالے کر دینا ۔ یہ ساری باتیں ادبی بیٹھکوں یا چائے خانوں میں موضوعِ سخن ہوا کرتی تھیں۔ منٹو کے مرتے ہی دوستوں، عزیزوں، شناساؤں نے اپنی اپنی یادداشتیں جمع کر دیں۔ مضامین ہی نہیں، ابو سعید قریشی اور محمد اسد اللہ کی کتابیں بھی آگئیں۔ نقوش، افکار، شاعر اور دیگر ڈنڈی نے منٹو کے انتقال کے فوراً بعد منٹو نمبر شائع کر دیئے۔ کئی سال تک یہ ہما ہمی رہی۔ پھر ٹھنڈے دل سے منٹو کی فنکارانہ حیثیت کے تجزیے شروع ہوئے۔ یہ کام ممتاز شیریں، نوری یا ناری کے ذریعے کیے جا چکے تھے [illegible] کام آگے بڑھایا [illegible] چند کے بعد

اردو افسانے کے عناصر اربعہ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت (اسی ترتیب کے ساتھ) تسلیم کئے جاتے تھے منٹو کی بازیافت اس طرح ہوئی کہ انہیں اردو افسانے کا سب سے بڑا فن کار مانا گیا۔ بیدی اپنی فن کارانہ خصائص کی بنا پر کبھی دوسرے کبھی پہلے نمبر پر لائے گئے۔ کرشن چندر کے لئے تیسرا نمبر بھی مشکوک قرار پایا۔ بہرحال اس سے قطع نظر کہ منٹو، پریم چند کے بعد اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں یا نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ایک نہایت بلند پایہ افسانہ نگار ہیں اور انہیں فحش نویس کہہ کر ٹالنے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں، وہ سب کی سب ناکام ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی نے پی ایچ۔ ڈی کے لئے لکھا ہوا اپنا تحقیقی مقالہ سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یوں بھی منٹو سے برج پریمی کو خاص شغف ہے اور وہ منٹو کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں سے متعلق مضامین کی صورت میں نئی معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ کم لوگ منٹو کے ہمہ جہت فنی اور شخصی پہلوؤں پر اتنی نظر رکھتے ہوں گے جتنی ڈاکٹر برج پریمی رکھتے ہیں۔

یہ تحقیقی مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب جو ۱۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے منٹو کی سوانح حیات اور ان کی شخصیت کے ترکیبی عناصر سے متعلق ہے۔ اس حصے میں منٹو کی گھریلو زندگی، ان کے مذہبی رویے، سیاسی مسلک، خوراک، لباس، نفاست پسندی اور دوسرے خصائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب میں ان مقدموں کا بھی ذکر ہے جو منٹو کے افسانوں پر چلائے گئے۔ 'کھول دو' کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ برج پریمی نے لکھا ہے۔ "اس افسانے کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر مقدمہ چلایا گیا یا نہیں"۔ دراصل یہ غلط فہمی 'نقوش' کے منٹو نمبر کی پیدا کردہ ہے حقیقت یہ ہے کہ 'کھول دو' پر ابھی تک کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ البتہ یہ صحیح ہے (جیسا کہ برج پریمی نے بھی لکھا ہے) کہ اس افسانے کو شائع کرنے کی پاداش میں 'نقوش' کی اشاعت پر حکومت پاکستان نے چھ ماہ کے لئے پابندی عاید کر دی تھی۔ منٹو کے سارے مقدموں کی تفصیل 'دستاویز' (مرتبہ: بلراج مین را) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

برج پریمی کے تحقیقی مقالہ کے دوسرے باب میں اردو کے مختصر افسانے کی تاریخ منٹو سے پہلے

تک سوا سو صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ تیسرا باب بھی جو منٹو کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا بہت تفصیلی اور عمدہ تنقیدی جائزہ ہے۔ تقریباً سوا سو صفحات پر محیط ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مقالے کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ چوتھے باب میں منٹو کے مضامین انشائیوں اور خاکوں پر اور پانچویں باب میں ان کے خطوط پر اظہار خیال ہے۔ آخری باب میں منٹو کی ان نگارشات سے بحث کی گئی ہے جو ڈرامہ ناول تراجم اور صحافت کی ذیل میں آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ منٹو کی زندگی شخصیت اور ان کی ادبی، صحافتی اور فلمی سرگرمیوں کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر برج پریمی نے محققانہ اور ناقدانہ نظر نہ ڈالی ہو۔ برج پریمی کا سارا رویہ علمی اور معروضی ہے۔ یہ تحسین شناسی تو ہے لیکن اسے قصیدہ خوانی سے دور کا بھی علاقہ نہیں چونکہ تحقیقی مقالے کے مختلف ابواب اور ان کے حصے مختلف مواقع پر لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں کچھ باتوں کا اعادہ REPETITION ہونا ایک حد تک ناگزیر ہے مگر مقالے کو کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے نظر ثانی کے وقت اس عیب کو دور کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس کتاب میں یہی ایک کمزوری نظر آئی۔ یہ تحقیقی مقالہ موصوف کی عرق ریزی اور محنت کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ منٹو پر لکھی ہوئی دوسری تحریروں سے بے نیاز کر دے گا۔

ترتیب:۔ اوناش ایمہ

اہلِ قلم کے تاثرات

زندگی کے ہر شعبے میں اہلِ دانش اور اہلِ علم کی آرا کو سرمۂ بصیرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ معاصرین میں بسا اوقات چشمک کی جوالا بھڑکتی رہتی ہے پھر بھی ہمعصروں کی آرا میں ایک وزن ایک اعتبار ہوتا ہے۔ والدِ محترم کے حلقۂ احباب کا دائرہ کافی وسیع کافی کشادہ تھا۔ اُن کی بے وقت موت پر متعدد اہلِ قلم اور اہلِ علم لوگوں نے نہ صرف اُن کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا ہے بلکہ اُن کی زندگی اُن کی تحریروں اور اُن کی دین کے بارے میں اپنے تاثرات کا بلا جھجک اظہار کیا ہے۔ ان تعزیت ناموں میں تخلیق کاروں کا اندرون فرطِ غم سے اُبل پڑا ہے۔ کل کے محقق کی راہوں کو آسان کرنے کی خاطر میں ایسے چند ایک تعزیت ناموں کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ والدِ محترم کو اہلِ سخن اور اہلِ دانش کس نظر سے دیکھتے تھے ۔——— (پریمی رومانی)

پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)

ڈاکٹر برج پریمی نے اردو زبان و ادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ اُن کی اہمیت مُسلم ہے۔ منٹو پر اُن کی کتاب ایک بڑے فن کار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی (پاکستان)

آپ کے والدِ گرامی محترم ڈاکٹر برج پریمی کی وفات کی خبر پاکر بے حد دکھ ہوا۔ ابھی اُن کی عمر ہی کیا تھی اور پھر چند روز کی علالت انہیں ہم سے چھین لے گئی۔ میری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجئے۔ میرے لائق کبھی کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف لکھیئے گا۔

ابوسعید قریشی (کراچی)

میں بہت دنوں سے یاد کر رہا تھا لیکن نیا پتہ معلوم نہ ہونے کے باعث اس دھن میں تھا۔ کہ دلّی کے کسی مُدیر سے پوچھوں کہ ہمارا دوست کہاں ہے۔ پریمی کا پریم تو زندہ ہے۔ برخوردار..... برج کی مستقل مزاجی اور تجسس کی داد دیتا ہوں۔ اس کے شغف کو آگے بڑھائیے۔

اُوپندر ناتھ اشک (الٰہ آباد)

اچانک تمہارے والد اور ہمارے عزیز دوست برج پریمی کی وفات کی روح فرسا خبر ملی۔ لمحہ بھر کے لئے تو یقین بھی نہیں آیا..... یہ تو سُنا تھا کہ انہیں پیشاب میں شکر آتی ہے لیکن یہ بیماری تو آج کل عام ہے اور لوگ اس کے باوجود اسی/پچاسی برس تک جیتے ہیں لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ موت پر کسی کا بس نہیں اور آئی کو کون ٹال سکتا ہے۔ میری اور میرے پریوار کی طرف سے اس جانکاہ حادثے پر ہماری تمام ہمدردیاں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ خدا پریمی کی رُوح کو سکون عطا کرے۔ انہیں ابھی بہت کام کرنے تھے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (نئی دہلی)

پریمی صاحب کے انتقال سے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں تنہا تھا اور زیادہ تنہا ہو گیا۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس لئے میں اُن کو اپنے بھائیوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لق و دق دُنیا میں بالکل اکیلا کھڑا ہوں۔ ان کی بے ریا محبت ان کا بے پناہ خلوص اُن کا ذوقِ علم اور ان کی شرافتِ نفسی ہماری سب سے بڑی دولت ہے اور میں دراصل اُن کے پاؤں کی دُھول بھی نہیں..... اللہ تعالیٰ آپ کو اور اہلِ خاندان کو اس صدمہ کے

برداشت کرنے کی قوت دے اور آپ ان کے نقش قدم پر چل کر خاندان کا اور کشمیر کا نام روشن کریں۔

پروفیسر مسعود حسین خان (علی گڑھ)

آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر برج پریمی مرحوم کے اچانک انتقال کا سن کر سخت صدمہ ہوا۔ یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کشمیر میں ان سے بارہا ملاقات رہی اور ان کی شخصیت کا تاثر میرے دل پر بہت اچھا رہا۔ ابھی تو انہیں بہت کام کرنا تھا۔ آپ کو بھی ان کی بہت ضرورت تھی اور اردو کو بھی۔ انہوں نے از راہ عنایت مجھے منٹو پر اپنی تصنیف کا ایک نسخہ بھیجا تھا۔ جسے میں نے نہائت دلچسپی سے پڑھا اور توقع کرتا تھا کہ وہ اس قسم کی اور چیزیں لکھیں گے۔

آپ کے غم میں شریک —

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی (گوہاٹی)

سورگیہ برج پریمی کے خلوص اور ادب میں ان کے مقام و مرتبہ سے کون ناواقف ہوگا۔ افسوس ہے کہ چند یادوں کے سوا' اشک آلودہ یادوں کے سوا برج پریمی کی کوئی تصنیف میرے پاس نہیں ہے۔ موصوف جامع الصفات ادیب ۔ اور اردو کے سچے خدمت گزار تھے۔ تین مرتبہ سرینگر میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ جس حسن اخلاق و خندہ پیشانی سے ہر کام کرنے کی اُن کی عادت و سیرت تھی' وہ ضرب المثال کہی جا سکتی ہے..... اس مقام تک پہنچنا معمولی کام نہیں ہے +

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں)

اس سے ذرا قبل جب میں یورپ میں تھا' مجھے اپنے عزیز دوست کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی تھی۔ چونکہ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا' میں آپ کو تعزیت کا خط نہ لکھ سکا۔ ان کے انتقال سے مجھے دلی صدمہ ہوا تھا۔ پرماتما ان کی آتما کو شانتی دے۔

کچھ مدت پہلے اُن کی کتاب پر میں نے ایک مضمون خود ان کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا تھا۔ ابھی نامکمل ہی تھا کہ ایک سفر سامنے آگیا جس کی وجہ سے وہ مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ میں اب اسی نامکمل مضمون کی تلاش میں ہوں' مل جائے تو اُسے مکمل کر لوں تاکہ آپ کی کتاب میں شامل ہو سکے +

پروفیسر عنوان چشتی (دہلی)

...... اپنے عزیز دوست ڈاکٹر برج پریمی کو یاد کرتا رہا اور ظاہری آنکھوں سے نہ سہی لیکن دل سے رونا رہا۔ وقت جو زخم لگاتا ہے خود ہی اُس کے لئے مرہم فراہم کرتا ہے۔ برج پریمی صاحب کے انتقال کو اتنے دن ہو گئے ہیں کہ آپ کا دل بھی اب دنیا داری کے کاموں میں لگ گیا ہو گا۔ پھر بھی صبر و شکر کی تلقین کرتا ہوں کہ یہی حادثوں کو برداشت کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کے انتقال سے اردو ادب کو جو نقصان ہوا ہے اُس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میرے لئے اور میرے جیسے دوسرے لوگوں کے لئے دوہرا غم ہے۔ ایک دوست کے بچھڑ جانے کا اور دوسرا اردو کے ایک اچھے قلم کار کے جُدا ہو جانے کا۔ گھر میں سب کو تعزیت کر دیجئے۔

پروفیسر قمر رئیس (دہلی)

کسی طرح یقین نہیں آتا کہ میرے عزیز دوست برج پریمی صاحب ہم سے جُدا ہو گئے ہیں۔ بھائی صبر کرو کہ اور کوئی چارہ نہیں۔ مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ کیسے اعلیٰ اخلاق اور ادبی ذوق کے مالک تھے۔ مجھے اپنے دُکھ میں برابر کا شریک سمجھو۔ اپنی والدہ محترمہ سے بھی تعزیت کرنا۔ خدا تم لوگوں کو صبر کی طاقت دے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم (حیدر آباد)

آپ کے والد صاحب کی وفات پر تعزیت نامہ "سب رس" میں شائع کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کا مضمون بھی۔ ان کی رحلت کا نہایت افسوس اور غم ہے۔ کچھ دنوں تک تو باور ہی نہیں آیا کہ اطلاع درست ہے...... کسی اخبار یا رسالے میں جب خبر پڑھی تو توثیق ہوئی۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی (دہلی)

آپ کے والد کے انتقال کی خبر مل گئی تھی...... بہت افسوس ہوا اس سانحے پر۔ جب بھی سرینگر جانا ہوتا تھا۔ اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔ بڑے متین اور مہذب انسان تھے اور ان سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

یہ بات اطمینان کی ہے کہ آپ کو علمی تلاش و تصنیف کا ذوق ورثے میں ملا ہے اور آپ لگن کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ آپ کی ترقی کے لئے میری دعائیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (دہلی)

میں کل ہی سفر سے واپس آیا ہوں۔ یہاں اس افسوس ناک سانحہ کی خبر ملی۔ یہ خبر اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ میں نے اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے دو بار خط پڑھا۔ مگر حقیقت سے گریز نہ کر سکا۔ برج پریمی صاحب میرے عزیز دوست تھے اور مجھ سے بے تکلف بھی تھے۔ میں جب کشمیر جاتا تو کافی وقت اُن کے ساتھ گذارنے کی کوشش کرتا..... خدا اُن کی رُوح کو سکون عطا کرے...... خدا آپ کو صبر عطا کرے۔ دوسرے احباب تک میرا پیغام تعزیت پہنچا دیجئے۔ یہ غم تنہا آپ کا نہیں ہے۔ ہم سب اس میں شریک ہیں۔

کشمیری لال ذاکر (چنڈی گڑھ)

اس خبر سے مجھے دلی صدمہ ہوا کہ آپ کے والد محترم ڈاکٹر برج پریمی انتقال کر گئے جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہ میرے عزیز دوست تھے اور اس خبر نے مجھے شدید دُکھ پہنچا دیا۔ کچھ عرصہ قبل اُن کا ایک بڑا ہی دلنواز اور خوبصورت خط مجھے ملا تھا۔ کبھی اس کا یقین نہیں تھا کہ وہ ہم سے اتنی جلد جُدا ہو جائیں گے۔ مہربانی کر کے میری اور سے اپنی والدہ تک اس افسوس ناک حادثے پر تعزیت کا اظہار کیجئے۔ میں آپ کے دُکھ میں برابر کا شریک ہوں اور بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتا ہوں کہ اُن کی رُوح کو شانتی ملے۔ ہریانہ اردو اکادمی نے ڈاکٹر صاحب کے انتقال پُرملال پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (تریتی)

یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ میرے انتہائی عزیز اور مخلص دوست آپ کے ابا حضور ڈاکٹر برج پریمی نے داعی اجل کو لبیک کیا۔ مالک حقیقی اُن کی رُوح کو شانتی عطا کرے اور آپ سب کو صبر کی دولت سے نوازے۔ آپ سب کے دلوں پر جو گذر رہی ہو گی اس کا اندازہ کوئی نہیں

کر سکتا۔ برج پریمی مرحوم سے میرے نہایت گہرے مراسم تھے..... وہ ایک بلند پایہ ادیب ہی نہیں شریف النفس انسان بھی تھے۔

آپ کی والدہ محترمہ اور دیگر بہنوں بھائیوں و متعلقین تک بھی میری تعزیت پہنچادیں خدا آپ سب کو صبر دے اور آپ کے بھائی اور بہن اپنی آئندہ زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار رہیں۔

حبیب کیفوی (پاکستان)

ڈاکٹر برج پریمی کی وفات کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کی روح کو شانتی بخشے اور آپ کو ڈاکٹر صاحب کے دوسرے عزیزوں کو اس صدمہ پر صبر کی توفیق میسر ہو۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی حسرت ہی رہی۔ سوچتا تھا کہ کبھی نہ کبھی ملاقات ہو جائے گی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

بلراج کومل (دہلی)

یہ جان کر انتہائی دکھ ہوا کہ آپ کے والد محترم جناب برج پریمی کی وفات ہو گئی مرحوم سے میری کل ملا کر تین ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن ہم ان کی عظمت، ادب دوستی اور خیر باکی تمازت کے رشتے میں ہمیشہ منسلک رہا۔ منٹو پر جب ان کی کتاب شائع ہوئی تو انھوں نے بطور خاص میرے پاس بھجوائی منٹو کے بارے میں اس کتاب کی مستقل دستاویزی اور انتقادی اہمیت ہے تجربے کے اعتبار سے بھی اس کا دائرۂ عمل بڑا وسیع ہے۔

میں آپ کے پاس ہوتا تو آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کے دکھ میں شریک ہوتا میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ خدا آپ کو اور گھر کے سب لوگوں کو صبر و تحمل سے یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔

مظہر امام (پٹنہ)

برج پریمی صاحب کا انتقال میرا ذاتی سانحہ ہے۔ نہ پوچھئے جب یہ خبر ملی تھی دل پر کیا گزری۔ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا۔ اس لئے تعزیت کا خط نہ لکھ سکا مرحوم سے مجھے دلی لگاؤ

تھا۔ اور میں ان کی ادبی سرگرمیوں کو ہمیشہ بہ نظرِ استحسان دیکھتا تھا۔ ان کی وفات اردو ادب کا ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ میں آپ کے آپ کی والدہ کے اور تمام اعزا کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

زبیر رضوی (دہلی)

یہ دکھ بھری خبر ملی کہ ڈاکٹر برج پریمی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ انہوں نے واقعی منٹو سے ٹوٹ کے عشق کیا اور اس کا ثبوت ان کی کتاب تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ اثاثے کو پڑھنے والوں تک پہنچانا آپ کا کام ہے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

پروفیسر صابر آفاقی (پاکستان)

آپ کے پیارے پتا برج پریمی میرے دوست تھے کئی برسوں تک میری ان سے خط و کتابت رہی۔ وہ زبردست محقق اور محبِ وطن تھے۔ افسوس کہ آپ اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور بے شمار لوگوں کو سوگوار چھوڑ گئے ہیں۔

خواجہ عبدالصمد وانی (راولپنڈی)

افسوس ہے کہ مجھے آپ کے فاضل والد ڈاکٹر برج پریمی آنجہانی کی موت کی اطلاع خاصی دیر سے ملی ہے۔ اس لئے میں کشیر میں آنجہانی کے بارے میں تعزیتی نوٹ شامل نہ کر سکا۔ اس کا ہمیشہ مجھے افسوس رہے گا۔ میرا اگرچہ ان سے ذاتی تعارف اور ذاتی نیاز حاصل نہ تھا لیکن مادرِ وطن کشمیر کے ایک فاضل فرزند کے ناطے میں ان سے ناآشنا بھی نہ تھا۔

پروفیسر سیف الدین سوز (ایم۔ پی) دہلی۔

یہ خبر میرے لئے نہائیت ہی افسوس ناک ہے کہ میرے عزیز دوست جناب برج پریمی عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ اس افسوسناک سانحے کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ برج پریمی جیسے معروف انسان اپنے عزیز و اقارب سے دور جموں میں انتقال کر گئے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اردو کی تبلیغ کے لئے آپ ان ادبی کارناموں

کو پورا کیجئے جو اُن کے چلے جانے سے نامکمل رہ گئے ہیں۔

خدا آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے۔

ہرچرن چاولہ (ناروے)

آپ نے برج پریمی صاحب اور تمام فیملی کی خیریت جاننے کے لئے میں نے جگن ناتھ آزاد کو خط لکھا تھا اور اُن کے خط سے پریمی صاحب کی افسوس ناک رحلت کی خبر چند روز پہلے ملی تھی مگر دل اس خبر کو ماننے سے یکسر منکر تھا۔ ...... اب یہ بات پختہ ہو گئی کہ محترم پریمی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔

..... میں آپ کا دُکھ سمجھتا ہوں۔ والدین کا سایہ از حد ضروری اور تاعمر درکار ہوتا ہے مگر اُوپر والے کے ہاتھ اتنے مضبوط اور بے لحاظ ہوتے ہیں کہ وہ جب چاہے یہ سایہ سر سے اُٹھا لیتا ہے اور پسماندگان کو حالات کی ننگی دُھوپ میں تڑپنے اور سڑنے کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوست احباب تو آپ کو صبر کی تلقین اور جانے والے کی آتما کی شانتی کے لئے پرارتھنا کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں میری بس یہی دُعا ہے کہ بھگوان اُنہیں اپنے چرن کملوں میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔

رشید امجد (راولپنڈی)

برادرم برج پریمی کے انتقال کی افسوس ناک خبر ملی۔ انتہائی دُکھ اور صدمہ ہوا۔ مرحوم سے میرے بڑے برادرانہ تعلقات تھے۔ ..... اُن کی موت ادبی حلقوں کے لئے ایک صدمہ تو ہے ہی لیکن خصوصاً "کشمیر" پر کام کرنے والوں میں ایک بہت ہی اہم نام کم ہو گیا ہے۔ اس دُکھ میں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ازراہِ کرم اپنے دیگر اہلِ خانہ تک بھی یہ جذبات پہنچا دیجئے۔

مانک ٹالا (ممبئی)

آپ کے والد بزرگوار کی رحلت کی خبر پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ بھگوان سے پرارتھنا

ہے کہ وہ ان کی آتما کو شانتی پردان کریں۔ براہ مہربانی اپنی والدہ صاحبہ اور گھر کے دیگر متعلقین کو میری طرف سے اظہار افسوس کر دیں۔ اس عمر میں بھگوان کو پیارے ہو جائیں گے اس کی امید نہیں تھی۔

محمد منظور احمد (ماہنامہ سب رس، حیدر آباد)۔

آج ہی آپ کے والد محترم اور میرے کرم فرما جناب ڈاکٹر برج پریمی کے سانحۂ ارتحال کی الم انگیز اطلاع ملی۔ بہت دیر تک دل پر غم کی فضا طاری رہی۔ مرحوم جناب ڈاکٹر برج پریمی صحت کی خرابی اور ادبی و علمی مصروفیات کے باوجود مجھے اپنے نوازش ناموں کے ذریعہ یاد فرمایا کرتے تھے۔ وہ بے حد پُر خلوص اور شریف النفس انسان تھے۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کی روح کو شانتی اور سکون عطا فرمائے اور آپ کو آپ کے دیگر تمام رشتہ داروں اور مرحوم کے قدردانوں اور چاہنے والوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

افتخار امام صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر بمبئی)۔

آپ کے والد محترم برج پریمی کے انتقال کی خبر سے دکھ ہوا۔ خدا آپ کو اور آپ کے جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مسعود منظر (مدیر ماہنامہ سہیل گیا)

یہ جان کر کہ آپ کے والد محترم جناب ڈاکٹر برج پریمی انتقال فرما گئے، کافی افسوس ہوا۔ ڈاکٹر موصوف صرف ایک شخص کا ہی نہیں بلکہ ایک انجمن کا نام تھا.... موصوف کی بے وقت موت نے ادارہ سہیل کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ ادارہ سہیل اپنی مجلس ادارت کے رکن اور آپ کے والد مرحوم کے انتقال پُر ملال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ادارہ آپ کے اس غم کی گھڑی میں خدا سے دعا کرتا ہے کہ آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

قیصر سرمست (حیدرآباد)۔

اس منحوس اور دلخراش خبر کو مان لینے کے لئے میرا دل دماغ تیار نہیں ہو رہا ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ میرا بھائی میرا دوست میرا کرم فرما مجھ سے دور ہو گیا۔

احمد وصی (بمبئی)۔

...... محترم ڈاکٹر صاحب جنہیں آنجہانی لکھنے کو دل نہیں چاہتا ایک ادیب اور اردو تہذیب کے نمائیندہ تھے۔ ان سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اردو سے واقف ہے ان کی کمی محسوس ہوتی رہے گی اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔

خاندان کے دیگر افراد تک میری تعزیت پہنچا دیں۔

ڈاکٹر مجید مضمر (سرینگر)۔

خدا آپ کو والد کے انتقال کا صدمہ برداشت کرنے کے لئے صبر جمیل عطا کرے۔ میں جانتا ہوں کہ تھپکیاں اور تسلیاں اس موقعہ پہ کام نہیں آتیں اور نہ ہی آپ کے دکھ کو کم کر سکتی ہیں..... یہ خبر جس دکھ کے ساتھ میں نے سنی اس کا اظہار میں نہیں کر سکتا..... ...... میں اسے اپنے تئیں ذاتی نقصان محسوس کرتا ہوں۔ آپ کے غم میں شریک کیسے ہو سکتا ہوں کہ یہ غم میرا بھی ہے اور میرے لئے فقط میرا۔ آپ کے ساتھ آخری رسوم میں شرکت نہیں کر سکا۔ اس کا افسوس ہے۔ اپنی والدہ کا خیال رکھئے گا۔

ایک اہم کتاب

سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے

ڈاکٹر برج پریمی کا معرکتہ آلارا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ

چند تاثرات:

● آپ کی کتاب مبارکباد کی مستحق ہے۔ اتنی محنت کم لوگ کرتے ہیں... آپ نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے.... یہ کتاب قند مکرر ہے۔ تعصب سے بلند و بالا جسمیں فنکار کی تکریم اور فن کے کمال دونوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

——— ابوسعید قریشی (کراچی)

● منٹو کے بارے میں درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر مفصل اور مبسوط کتاب کوئی نہیں ہے۔ اسلئے ہم ڈاکٹر برج پریمی کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں منٹو پر ایک مکمل اور مبسوط کتاب لکھ دی ہے۔ ——— خواجہ احمد عباس (مرحوم) بمبئی

● آپ کی کتاب سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے بہت خوب ہے آپ کی متانت میں درد مندی اس طرح آمیز ہے کہ منٹو کی شخصیت خوب ابھر کر سامنے آئی ہے انداز بیان ایسا سلجھا ہوا ہے کہ یہ تحقیق منٹو کے افسانہ سے کم دلچسپ نہیں۔ ——— خواجہ احمد فاروقی، دہلی

● برج پریمی نے سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو ابھی تک منٹو پر شائع ہونیوالے سبھی مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے، یہ کتاب ابھی تک منٹو پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے اور اردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ ——— ڈاکٹر محمد حسن (دہلی)

● آپ کی بیش بہا کتاب سعادت حسن منٹو ملی۔ کتاب خوب سے خوب ہے بہت مفصل جامع اور تحقیقی، آخری جز و سعادت حسن منٹو۔ ایک نظر میں بیت الغزل ہے کوزے میں دریا بھرنا اسی کو کہتے ہیں۔ کتنی زیادہ معلومات، کتنے تھوڑے صفحات میں سمادی ہیں۔ ——— پروفیسر گیان چند جین (حیدرآباد)

● کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ منٹو پر مواد آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ مگر آپ نے کافی محنت کی ہے... اس سے ہر نیا کام کرنے والا مستفید ہو سکتا ہے۔

——— کالی داس گپتا رضا (بمبئی)